بے گُمان لمحے

اسماء قادری

مکمل ناول

بے گمان لمحے

اسما قادری

"واہ یار......! کیا زبردست ہاتھ مارا ہے تم دونوں بہنوں نے، اتنے چارمنگ اور ہینڈسم لڑکوں کا مل جانا وہ بھی بیک وقت دو بہنوں کے لیے معمولی بات نہیں ہے۔" سفید شلوار قمیص اور سرمئی دوپٹوں میں ملبوس چھ سات لڑکیوں پر مشتمل وہ ٹولا گھاس کے ایک قطعے پر براجمان تھا اور توجہ سے وہ البم دیکھ کر اس پر تبصرہ کر رہا تھا جو ارم اور صنم کی منگنی کی تصویروں پر مشتمل تھا۔ حال ہی میں منگنی کی فہرست میں شامل ہونے والی دونوں بہنیں ان تبصروں سے بھرپور لطف

اندوز ہو رہی تھیں۔ دونوں کے ہونٹوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

''ہاں دیکھو تو ذرا کیا زبردست کمال ہوا ہے، ایک تو یہ دونوں بہنیں جڑواں ہیں اوپر سے انہیں رشتے بھی جڑواں بھائیوں کے مل گئے۔ ایسا لگتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ہمیشہ ساتھ رکھنے کے لیے خاصا اہتمام کیا ہے۔'' البم کے ایک ہی صفحے پر ان دونوں کی اپنے اپنے منگیتر کے ساتھ لگی تصویروں کو دیکھتے ہوئے ایک اور لڑکی نے تبصرہ کیا۔ واقعی دونوں جوڑے ہی بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے زیادہ خوب صورت یا کم تر قرار نہیں دیا جا سکتا تھا بلکہ ایک جیسے ملبوسات، میک اپ اور جیولری کی وجہ سے ایک سرسری نظر میں یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہ ایک ہی جوڑے کی الگ الگ تصاویر ہوں۔

''ویسے تو ٹھیک ہے یار کہ دونوں بہنیں ہمیشہ ساتھ رہیں گی لیکن گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے۔ ان دونوں نے تو چلو اپنی الگ، الگ شناخت ظاہر کرنے کے لیے ہیئر اسٹائل وغیرہ کی مدد لے رکھی ہے اور ہم بھی آسانی سے پہچان لیتے ہیں کہ جن خاتون کی لمبی بل کھاتی ناگن جیسی چوٹی ہے وہ ارم صاحبہ ہیں اور جن محترمہ نے اسٹیپ کٹنگ کروا رکھی ہے وہ صنم ہیں لیکن یہ دونوں اپنے، اپنے شوہر حضرات کو کیسے پہچانیں گی کہیں ایسا نہ ہو کہ شادی کے بعد بار بار گڑبڑ ہوتی رہے اور دونوں اپنے والے کے دھوکے میں دوسرے کے گلے لگ جایا کریں۔'' ایک لڑکی نے بظاہر چہرے پر تشویش پھیلاتے ہوئے چمکتی آنکھوں سے یہ سوال کیا تو سب ہنس دیں۔

''جی نہیں، ایسی کوئی گڑبڑ نہیں ہو سکتی کیونکہ عاصم کا قد راحم سے ایک انچ لمبا ہے اور قد کی وجہ سے دونوں کو آرام سے پہچانا جا سکتا ہے۔'' ارم نے قدرے برا مانتے ہوئے اعتراض کا جواب دیا۔

''تو کیا تم اپنے میاں کے گلے لگنے سے پہلے انچی ٹیپ لے کر اس کا قد ناپا کرو گی۔'' وہ لڑکی بھی خاصی چلبلی تھی فوراً ہی ایسا جواب دیا کہ زوردار قہقہہ پڑا۔ قہقہہ اتنا زوردار تھا کہ فاصلے پر بیٹھی دوسری ٹولی کی لڑکیوں نے بھی لمحہ بھر کے لیے مڑ کر ان کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر دوبارہ اپنی گفتگو میں مصروف ہو گئیں۔ ہر ایک جانتا تھا کہ فری پیریڈ میں جب بھی لڑکیوں کی مختلف ٹولیاں کالج کے مختلف مقامات پر ڈیرے ڈالتی تھیں تو ایسے چٹکلے ضرور چھوڑے جاتے تھے جن کے نتیجے میں زوردار قہقہے پڑتے۔ اگر جو ایسے وقت میں کوئی لیکچرر صاحبہ قریب موجود ہوتیں تو ان لڑکیوں کو تھوڑی سی ڈانٹ ڈپٹ پڑ جاتی اور کچھ نصیحتیں سننی پڑتیں لیکن بہرحال کوئی بھی اپنی روش نہیں بدلتا تھا۔

''تم ذرا انڈین فلمیں کم دیکھا کرو۔ ان فلموں کو دیکھ دیکھ کر ہی تمہیں یہ گلے ملنے لگنے کی خرافات یاد آ رہی ہیں۔'' ارم، صنم کے مقابلے میں ذرا سنجیدہ مزاج کی حامل تھی اس لیے اس کی طرح سہیلیوں کے مذاق پر قہقہے لگانے کے بجائے انہیں تادیب کرنے لگی۔

''او کے یار برا مت مانو۔ اگر تمہیں انڈین فلموں کے گلے لگنے والے سین پسند نہیں ہیں تو اپنے میاں کے پیر پڑ جایا کرنا۔ آئی مین ان کی طرح آشیرباد لینے کے لیے۔'' وہ لڑکی ارم کو چھیڑنے سے باز نہیں آ رہی تھی۔

''لاحول ولاقوۃ، تم یہ سارے سین اپنے لیے ہی سنبھال کر رکھو۔ کم از کم مجھے کسی انڈین فلم کے مناظر کی نقل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' ارم نے اسے جواب دیا۔

''چھوڑو ناں بس، یہ بدتمیز مذاق کر رہی ہے اور تم خوامخواہ اتنی سنجیدہ ہو رہی ہو۔ یہ سوچ کر انہیں معاف کر دو کہ یہ ساری کی ساری غیر منگنی شدہ ہم سے جل رہی ہیں جب ہی ایسی الٹی سیدھی بکواس کر رہی ہیں۔'' صنم نے شرارت سے ایک آنکھ دباتے ہوئے بہن کو سمجھایا تو باقی کی سب اس پر چڑھ دوڑیں۔

''کیا کہا، ہم تم سے جل رہے ہیں۔ جلتی ہے ہماری جوتی۔ ایسے باگڑ بلے جیسے منگیتروں سے ہم بغیر منگیتر کے ہی بھلے۔ پچکے ہوئے آڑوؤں جیسے تو لگ رہے ہیں دونوں۔'' کچھ دیر قبل جن منگیتروں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جا رہے تھے اب انہی میں سو سو نقص نکلنے لگے۔ اس سے قبل کہ یہ لڑائی سنجیدہ شکل اختیار کرتی پیریڈ بیل بج گئی اور سب کی سب اپنی چیزیں سمیٹتی ہوئی کلاس روم کی طرف دوڑیں کیونکہ شروع ہونے والا پیریڈ میڈم دلشاد کا تھا جو کلاس میں تاخیر سے آنے پر سخت ناراض ہوتی تھیں اور غیر حاضر ہونے پر اس سے بھی شدید ترین۔

* * *

''آج پھر اتنے کم پیسے......؟ آخر تو دل لگا کر دھندا کیوں نہیں کرتا؟ تیرے نکمے پن نے میرا کباڑا کر دیا ہے۔ کچھ معلوم ہے تجھے کہ میں تیری جگہ کا کتنا بھاڑا دے رہا ہوں اور تو اتنے موقع کی جگہ سے مجھے اتنا بھی کما کر نہیں دے رہا ہے کہ میں اس کا بھاڑا ہی دے سکوں۔ مجھے اپنی کمائی میں سے تیری جگہ کا بھاڑا دینا پڑ رہا ہے۔ تیرہ سال کا ہو گیا ہے تو...... آخر کب اپنے پیروں پر کھڑا ہوگا؟ کیا ساری زندگی میں تجھے کما، کما کر کھلاتا رہوں گا؟ اپنے چھوٹے بھائی کو ہی دیکھ لے۔ تجھ سے پورے تین سال چھوٹا ہے لیکن میرے برابر کی کمائی کرنے لگا ہے۔ تھوڑے دنوں میں مجھ سے بھی آگے نکل جائے گا۔ میں اس سے بہت خوش ہوں پر تیری پھکر لگی رہتی ہے میرے بعد تو تو بھوکوں مرے گا۔'' سیاہ رنگت والا ناٹے قد کا جامو پوری آواز سے اپنے بڑے بیٹے کو ڈانٹ رہا تھا لیکن بیٹا اس کی بات پر کوئی بھی ردِعمل ظاہر کیے بغیر صحن کے کونے میں بنے چبوترے پر لگا نل کھول کر رگڑ رگڑ کر ہاتھ پیر اور منہ دھونے میں مصروف تھا۔ وہ دو بار اپنے ان تمام اعضا کو صابن مل کر دھو چکا تھا پھر بھی مطمئن نہیں تھا اور اب تیسری بار صابن لگانے جا رہا تھا۔

''بس کر...... تیری ماں جہیز میں صابن بنانے کی فیکٹری لے کر نہیں آئی تھی جو تو ہر روز اتنا ڈھیر صابن گھسنے بیٹھ جاتا ہے۔'' بیٹے کو اپنی طرف متوجہ نہ دیکھ کر جامو کو غصہ آ گیا اور اس نے چبوترے پر پہنچ کر ایک ٹھوکر سے صابن کو بیٹے کی پہنچ سے دور کر دیا۔

''صابن کی فیکٹری نہیں لے کر آئی تو کیا ہوا۔ مارکیٹ کے پاس والا ٹھڑا تو مجھے جہیز میں ملا تھا۔ صابن، منجن، پھل، سبزی کوئی بھی چیز آج تک تجھے خرید کر لانی پڑتی ہے۔ سب کچھ مفت میں آ جاتا ہے اور نقد کمائی الگ سے۔'' باورچی خانے کے طور پر استعمال ہونے والے چھپر کے نیچے بیٹھی اپنے چھوٹے بیٹے کی مدد سے تھیلیوں میں موجود مختلف قسم کے کھانوں کو برتنوں میں منتقل کرتی پنو نے تنتناتے ہوئے بلند آواز میں جامو کے طعنے کا منہ توڑ جواب دیا۔

''چل اوئے، زیادہ مجھے اپنی کارگزاریاں نہ گنوا۔ تو نے جو یہ نکمی اولاد پیدا کی ہے پہلے اس کو سدھار پھر مجھ سے گلا کر۔'' جامو نے پہلے اسے جھڑکا اور پھر ابھی تک پانی کی دھار کے نیچے ہاتھ رگڑتے بیٹے کی کمر پر ایک لات رسید کی۔

''چل اٹھ اِدھر سے۔'' لڑکے نے اس بار بھی کوئی جواب نہیں دیا اور ایک سسکی سی لیتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

''اِدھر آ جا ہاشو! آ کر روٹی کھا لے۔ اتنی سی شکل ہو رہی ہے۔ پتا نہیں دن بھر کچھ کھاتا پیتا بھی ہے یا نہیں۔'' پنو کی ممتا جاگی تو اس نے اسے آواز دے ڈالی۔ باپ سے ہونے والی خاطر کے بعد ہاشو کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ کھائے پیے لیکن خالی پیٹ دہائیاں دے رہا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا وہ کھانے کے لیے ماں کے قریب جا بیٹھا۔ اسی لمحے پنو نے ایک تھیلی کھولی تو بدبو کا زوردار بھبکا اٹھا۔

''ایک تو لوگوں کے دل سے خوفِ خدا اٹھ گیا ہے۔ اتنے بے ایمان ہو گئے ہیں کہ اللہ کے نام پر بھی سڑا ہوا کھانا فقیروں کو تھما دیتے ہیں۔'' پنو نے وہ تھیلی اٹھا کر دور پھینک دی لیکن بدبو گویا ہاشو کے دماغ میں بس گئی تھی۔ اسے زوردار ابکائیاں آنے لگیں۔

''تو کھانا گھر پر پکا لیا کر اماں! کیوں لوگوں کے بچے کھچے گلے سڑے کھانے لے کر آ جاتی ہے۔'' ابکائیوں پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے اس نے ماں سے فرمائش کی۔

''چل اوئے، پہلے ہی میں دن بھر ماری ماری پھر کر کمانے کے چکر میں جھل خوار ہوتی ہوں۔ لوگوں کے پیچھے پھر پھر کر گوڈے گٹے درد کرنے لگتے ہیں اوپر سے گھر آ کر ہانڈی روٹی بھی کرنے بیٹھ جاؤں۔ واہ پتر شاواوڈا خیال ہے تجھے اپنی ماں کا۔ ارے پاگلے! یہ چونچلے تو وہ کرتی ہیں جو سارا دن گھروں میں پڑی پلنگ توڑتی رہتی ہیں، تیری ماں کی طرح انہیں لور لور پھرنا نہیں پڑتا۔'' اس کی فرمائش پنو کو گویا بچھو کے ڈنک کی طرح لگی جو شروع ہوئی تو ایک ہی سانس میں پورا لیکچر دے کر چھوڑا۔

''تو مت جایا کر ناں تو کام پر۔ میں، ابا، روشو ہم تین، تین بندے جاتے تو ہیں کمانے کے لیے پھر تجھے کیا لوڑ پڑی ہے کمانے کی۔'' اس نے اپنی ابکائیوں پر قابو پا لیا تھا لیکن ابھی تک کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا سکا تھا اور اب ایک دوسری ہی بحث میں الجھ گیا تھا۔ جوشِ خطابت میں اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس کا باپ قریب ہی موجود ہے اور اس کے ان نادر خیالات کو ذرا برداشت نہیں کر سکتا چنانچہ نتیجہ کمر پر پڑنے والی ایک زوردار لات کی صورت میں نکلا۔

''وڈا آیا کماؤ پوت، ماں کو گھر میں بٹھا کر کھلانے والا۔ اس جوگا تو ہے نہیں کہ خود اپنے لیے کما کر کھا سکے ہور اوپر سے ماں کو گھر میں بیٹھنے کا مشورہ دے رہا ہے۔'' جامو نے غصے سے بولتے ہوئے دو تین لاتیں مزید اس کی کمر پر لگا دیں۔

''چل چھڈ دے جامو! بچہ ہے۔ میں کون سا اس کے کہنے پر گھر میں بیٹھنے لگی ہوں۔ مجھے ملوم اے کہ ہمارے دھندے میں مردوں سے زیادہ زنانیوں کی کمائی ہوتی ہے ہور میں اس گھر میں کلی ہی زنانی ہوں۔ میری کمائی میں تو تجھے شاہ جی کا حصہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا ہے پر اس نمانے کو ابھی ان ساری چیزوں کی عقل کہاں ہے۔ بہت سیدھا ہے میرا بچہ۔ کل بدھی میں آتے آتے تھوڑا وقت لگے گا۔'' چنو ماں تھی بیٹے کو یوں بری طرح پٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکی اور بیچ بچاؤ کروانے لگی۔

''ملوم نہیں کب عقل آئے گی اسے۔ یہ روشو اس سے دو سال چھوٹا ہے لیکن دھندے کو چنگی طرح سمجھ گیا ہے۔ روزانہ اس سے زیادہ کما کر لا کر دیتا ہے۔'' جامو نے غصے سے بڑبڑاتے ہوئے چھوٹے بیٹے کی طرف اشارہ کیا جو اس سارے قصے سے بے نیاز جلدی جلدی نوالے حلق سے اتار رہا تھا۔ اس کی ماں جو مختلف قسم کا کھانا سمیٹ کر لائی تھی اس میں ایک تھیلی چکن بریانی کی بھی تھی۔ شاید یہ کسی شادی کا بچا ہوا کھانا تھا جس میں خوش قسمتی سے بوٹیاں بھی موجود تھیں ورنہ عام طور پر لوگ انہیں جو بچا کھچا کھانا دیتے تھے وہ بوٹیوں سے محروم ہی ہوتا تھا۔ اب جو اتفاقاً بریانی اور وہ بھی بوٹیوں سے بھری ہوئی ملی تو موقع پرست روشو نے یہی مناسب سمجھا کہ ان تینوں کو آپس میں الجھا ہوا ہی رہنے دے اور خود موقع سے فائدہ اٹھا کر ساری بوٹیاں صاف کر لے۔

''اس کی مُدھی میں ملوم نہیں یہ ساری بکواس آئی کہاں سے؟ بھری برادری کے بیچ رہتا ہے ہور اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ سب لوگ کیسے رہتے ہیں فیر ملوم نہیں یہ کہاں سے الٹی سیدھی سوچتا ہے؟'' جامو کھانے کے لیے بیٹھ گیا اور روشو کے آگے سے بریانی کی پلیٹ کھینچ کر بڑبڑایا۔

''وہ جو تو شیطانی چرخا لایا ہے اس میں سے آتی ہیں اور کہاں سے آتی ہیں۔ کم بخت ٹی وی والے تو لگتا ہے دنیا کے کسی بندے کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں۔ ابھی تھوڑ[ے] دن پہلے ایک ڈراما دکھا رہے تھے فقیروں کے بار[ے] میں۔ اس ڈرامے میں دکھایا تھا کہ ایک فقیر بچہ اپنی برادر[ی] کو چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا اور بعد میں وڈا چنگا موٹر مکین[ک] بن گیا تھا۔ یہ اپنا ہاشو وڈا دل لگا کر وہ ڈراما دیکھ رہا تھ[ا]۔ مجھے لگتا ہے اس پر اسی ڈرامے کا اثر ہوا ہے۔'' چنو [نے] بڑے پتے کی بات بتائی جو کسی حد تک ٹھیک بھی تھی۔ ہا[شو] واقعی اس ڈرامے سے بہت متاثر ہوا تھا اور اس ڈرامے [کو] دیکھ کر اس کا بھی دل چاہا تھا کہ وہ اپنا گھر چھوڑ کر بھا[گ] نکلے لیکن ایسا کر نہ سکا کیونکہ اس ماحول کو سخت ناپسند کر[نے] کے باوجود اسے اپنے ماں باپ اور بھائی سے بہت محبت تھی اور اسے انہیں چھوڑنا بہت مشکل لگتا تھا۔

''ایسی ٹھکائی کروں گا کہ سارا ہیرو پن ناک کے راستے باہر نکل جائے گا۔ ہم پُرکھوں سے بھکاری چل[ے] آ رہے ہیں ہور تجھے بھی بھکاری ہی رہنا ہے۔ تم میں سے کسی نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش بھی کی تو ہاتھ پاؤں توڑ کر رکھ دوں گا اور بنا علاج کرائے اڈے پر لے جا[کر] ڈال دوں گا۔ فیر تو کوئی منہ سے مانگے نہ مانگے لوگ خو[د] ہی ترس کھا کر بھیک دے جائیں گے۔'' جامو کا رُخ[ِ] مخاطب ہاشو تھا جو ماں کے پیار سے چمکارنے پچکارنے [پر] کھانا کھانے بیٹھ گیا تھا اور مونگ کی پتلی دال کے ساتھ باسی روٹی کھا رہا تھا۔ اس نے باپ کی پلیٹ میں بچی کھچ[ی] بریانی پر نظر بھی نہیں ڈالی تھی کہ اس کے لیے خیرات م[یں] ملی دال اور بریانی برابر ہی تھی اور وہ اس خیراتی کھانے [کو] زبان کے ذائقے کے بجائے محض پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کھانے پر مجبور تھا۔

***

''اللہ کا کرم ہے دونوں بچیوں کے رشتے اچھے گھر[وں] میں ہو گئے ہیں۔ لڑکے پڑھے لکھے اور برسر روزگار ہیں۔ کئی سال سے میں ان لوگوں کو جانتا ہوں نہ کبھی حشمت [کو] کسی جھگڑے پھڈے میں پڑتے دیکھا نہ کبھی اس کے بیٹوں کے بارے میں کچھ الٹا سیدھا سننے میں آیا۔ [اس] لیے میں نے دو تین لوگوں سے مشورہ لینے کے بعد فو[راً] ہاں کر دی۔ آج کل اچھے رشتے ملتے ہی کہاں ہیں۔ کو[نے] والے شیخ صاحب کو ہی دیکھو۔ ان کی تینوں بیٹیاں پچی[س] سے اوپر کی ہو گئی ہیں اور ابھی تک ایک کا بھی رشتہ نہیں ہو[ا۔]

بے چارے بہت پریشان رہتے ہیں۔ آج کل کے حالات کو دیکھتے ہوئے میں اللہ تعالیٰ کا شکر دل کی گہرائیوں سے ادا کرتا ہوں کہ اس نے میری بیٹیوں کے لیے اتنی کم عمری میں رشتوں کا انتظام کر دیا ورنہ یہاں تو آگے پیچھے کوئی قبیلہ اور کنبہ وغیرہ بھی نہیں کہ میں امید کروں کہ بیٹیاں کسی بھائی، بہن کے گھر بیاہ جائیں گی۔'' وہ بولتے بولتے کچھ اداس ہو گئے تو خدمت گزار اور وفا شعار بیوی فوراً دل جوئی کے لیے کمربستہ ہو گئیں۔

''کسی کے نہ ہونے کا کیا غم...... جب اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ میں نے بھرے خاندان والوں کو بھی دیکھا ہے کہ لڑکے والے دولت یا اچھی شکل کے لالچ میں باہر کی لڑکیاں لے آتے ہیں اور خاندان کی لڑکیوں کو گھاس بھی نہیں ڈالتے۔''

''یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ آج کل لوگوں میں حرص اور لالچ بہت بڑھ گیا ہے۔ سنا ہے پہلے زمانے میں خاندانی لوگ رشتہ کرتے وقت شرافت کو ہی سب سے اہم سمجھتے تھے لیکن اب یہ ہونے لگا ہے کہ لوگ ظاہری مرتبہ اور دولت پر نظر رکھتے ہیں اس اعتبار سے ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارا واسطہ حشمت جیسے شخص سے پڑا جس نے اپنے لائق فائق اور خوب رو بیٹوں کی نیلامی لگانے کے بجائے میرے جیسے پرچون فروش کی بیٹیوں سے ان کا رشتہ جوڑ لیا۔ دس سال سے میری حشمت سے دوستی ہے۔ میں خود گواہ ہوں کہ اس کے بیٹوں پر کیسے کیسے لوگوں کی نظریں تھیں۔ اگر وہ لالچی آدمی ہوتا تو بیٹوں کے ذریعے دیکھتے ہی دیکھتے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔ دو ایک بار تو میں نے بھی مذاق ہی مذاق میں اسے کسی امیر خاندان میں گھر جیسا نہ بنانے کا مشورہ دے ڈالا تھا لیکن وہ بولا... افضل بھائی میں نے اپنے بیٹوں کو بڑی محنت اور محبت سے پالا ہے، میں ان کا باپ ہوں کوئی جانوروں کا بیوپاری نہیں کہ اچھی قیمت کی آس میں ان بیٹوں پر اتنی محنت کی ہو۔ میرے بیٹے رزقِ حلال کما رہے ہیں۔ ہمارا عزت سے گزارہ ہو رہا ہے۔ آگے چل کر بچے اور ترقی کریں گے تو ممکن ہے آج سے زیادہ خوش حالی آ جائے گی لیکن اگر میں شارٹ کٹ کے چکر میں انہیں کسی امیر خاندان میں پھنسا دوں تو میرے بیٹے ساری زندگی کے لیے دوسروں کی غلامی میں چلے جائیں گے اور ان کی بیویاں ہماری بہوئیں نہیں مالکن بن کر رہیں گی۔ نہیں بھائی، میں باز آیا ایسی دولت سے۔ میں تو ایسی لڑکیوں کو بہوئیں بنا کر گھر میں لاؤں گا جو بیٹی بن کر ہمارے ساتھ رہیں اور ہماری محبت کے جواب میں تمیز، تہذیب سے پیش آئیں۔ ایسی خصوصیات صرف شریف اور خاندانی لڑکیوں میں ہوتی ہیں، نو دولتیوں کی فیشن ایبل بیٹیوں میں نہیں۔'' میں اس کی بات سن کر قائل ہو گیا کہ واقعی حشمت ایک سمجھدار آدمی ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ خوش قسمتی سے دو دن بعد وہ میری ہی بیٹیوں کے لیے سوالی بن کر آ جائے گا، تمہیں یاد ہے ناں کہ ارم اور صنم کا رشتہ دیتے وقت اس نے کیا کہا تھا......؟'' افضل علی جیسے تصور کی آنکھ سے وہ منظر دیکھ رہے تھے جب ہی ان کی بیوی جمیلہ کو ان کے چہرے پر آسودہ سی مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی۔

''حشمت علی نے کہا تھا۔ افضل بھائی! جیسا خاندان اور بیٹیاں مجھے چاہیے ہیں اس کے لیے تم سب سے موزوں آدمی ہو۔ دس سال سے میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ تمہارا اور بھابی کا ایک، ایک انداز گواہی دیتا ہے کہ تم شریف اور عزت دار خاندان سے تعلق رکھتے ہو اور بچیوں کے بارے میں تو مجھے کوئی شک و شبہ نہیں کہ وہ ہمارے لیے اچھی بہوئیں ثابت ہوں گی، ہمارے سامنے ہی دونوں بچیاں بڑی ہوئی ہیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ تم نے اور بھابی نے مل کر بچیوں کی مثالی تربیت کی ہے۔'' وہ خوابیدہ سے لہجے میں کچھ اس طرح سے حشمت علی کے الفاظ دُہرا رہا تھا جیسے کسی بڑے مقابلے میں فتح پانے والی ٹیم کا مین آف دی میچ قرار دیا جانے والا فاتح کپتان اپنی ٹرافی کی وصولی کی یادگار داستان سنا رہا ہو۔ خود جمیلہ اس اشتیاق سے سب سن رہی تھیں کہ لگتا تھا پہلی بار ابھی ان کی زبان سے ہی اس ساری داستان سے واقف ہو رہی ہو حالانکہ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی ان کے لیے نئی نہیں تھی۔ شاید افضل علی کی زبانی ان ساری باتوں کو دُہرائے جانے سے ان کے اپنے بھی کسی جذبے کی تسکین ہو رہی تھی اسی لیے وہ نہایت دل جمعی سے کئی بار کی دہرائی باتیں سنتی جا رہی تھیں اور خود بھی ان باتوں میں وقتاً فوقتاً حصہ ڈال لیتی تھیں اس وقت بھی انہوں نے مسکراتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا۔

''مجھے یاد ہے کہ حشمت بھائی کے الفاظ سن کر آپ

کیسے بوکھلا گئے تھے۔ اس دن آپ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ حشمت بھائی اور بھابی کی خاطر مدارات کے لیے کیا کچھ پیش کر دیں۔ مجھے اور بچیوں کو گھن چکر بنا ڈالا تھا آپ نے...... بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ امریکا کا صدر ہمارے چھوٹے سے گھر میں آ گیا ہو۔"

"ارے چھوڑو، امریکا کے صدر کو تو میں اندر بھی گھسنے نہیں دیتا۔ میرا اس کالے کلوٹے، ظالم جابر سے کیا لینا دینا۔ وہ کم بخت تو جہاں گھستا ہے اسے کنگال کر کے چھوڑ دیتا ہے، ہمارے ملک کا حال نہیں دیکھا تم نے؟ حشمت کی تو بات ہی الگ ہے اس نے تو مجھے مالا مال کر دیا ہے۔ ایسی خوشی دی ہے کہ اب دل میں کوئی چاہت ہی نہیں رہی۔ بس اللہ میری بچیوں کو خیر سے ان کے گھر کا کرے اور وہاں ہنسی خوشی بسنا نصیب کرے۔" افضل علی نے بڑی بے ساختگی سے بیوی کی بات کا جواب دیا تو وہ ہنسنے لگیں اور بلند آواز میں "آمین" کہا۔

"سچ پوچھو تو میں جب بھی ارم اور صنم کی شادی کا سوچتا تھا حشمت کے بیٹوں جیسے لڑکوں کا خیال ہی دل میں آتا تھا۔ ہر طرح سے بڑے شاندار، قبول صورت جوان ہیں اچھا خاندان، تعلیم کسی چیز کی کمی نہیں ہے اوپر سے دونوں کے دونوں حافظ اور صوم وصلوٰۃ کے پابند بھی ہیں ورنہ آج کل لڑکوں میں یہ سب ایک ساتھ ملنا مشکل ہوتا ہے۔ جو زیادہ پڑھ لکھ لیتا ہے، وہ دین کو آؤٹ آف فیشن چیز سمجھنے لگتا ہے اور جو دینی رجحان رکھتا ہے وہ دنیا کے دوسرے کاموں کو حرام سمجھ بیٹھتا ہے۔ حشمت نے بڑے متوازن طریقے سے اپنے بیٹوں کی پرورش کی ہے۔ میں تو دن رات اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتا جس نے ایسی خوبیوں والے داماد کسی غیر متوقع تحفوں کی طرح جھولی میں ڈال دیے ہیں۔" افضل علی کا لہجہ خوشی، تشکر اور رقت سے بھرا ہوا تھا۔ جمیلہ کی آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی۔ افضل علی کی طرح وہ بھی اپنی بیٹیوں کے لیے ایسی ہی خواہشات اور جذبات رکھتی تھی لیکن دل میں ایک اندیشہ سا تھا کہ جانے اس کے خواب پورے بھی ہوں گے یا نہیں لیکن اب دونوں بیٹیوں کے رشتے طے پانے کے بعد جیسے سارے اندیشے اور واہمے ہوا ہو گئے تھے اور دل فقط خوشی و تشکر کے احساس سے لبریز تھا۔

"ارے بھئی، ابھی سے یہ آنسو وانسو آنکھوں میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں بیٹیوں کی رخصتی والے دن کے لیے اٹھا رکھو ابھی تمہیں رونے دھونے کے علاوہ اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ یوں تو حشمت نے کہہ دیا ہے کہ اسے بیٹیوں کے علاوہ ہمارے گھر سے کچھ نہیں چاہیے لیکن دستور کے مطابق ہمیں تو اپنی بیٹیوں کو دے کر ہی ان کے گھروں کو رخصت کرنا ہو گا۔ لڑکیوں کے اپنے بھی شادی کے حوالے سے بڑے ارمان ہوتے ہیں...... چاہتی ہیں کہ نئی زندگی شروع کریں تو اچھے اچھے کپڑوں اور زیورات کے ساتھ ساتھ برتنے کو نیا نکور سامان بھی ہو۔ تم دونوں بچیوں کے مشورے سے آہستہ آہستہ ان کے جہیز کی تیاریاں شروع کر دو تا کہ حشمت شادی کی تاریخ مانگنے آئے تو ہمیں ہڑابڑی میں تیاری نہ کرنی پڑے۔ غریب دکاندار ہوں۔ دیکھ بھال کر اور سوچ سمجھ کر خرچہ کرنا ہو گا۔" بیوی کو اداسی کی کیفیت سے نکالنے کے لیے انہوں نے گفتگو کا رخ ذرا سا تبدیل کیا تو خود بخود ہی لہجے میں ایک باپ کی فکر مندی جھلکنے لگی۔

"تیاری کی فکر نہ کریں۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ جس روز سے آپ نے اپنی پرچون کی دکان شروع کی ہے تمام آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کر کے بچیوں کے لیے جوڑتی رہی ہوں۔ زیور اور برتنوں کے علاوہ بھی بہت کچھ جمع کر رکھا ہے میں نے۔ اللہ کے کرم سے بچیاں بھی فرمانبردار اور سگھڑ ہیں۔ پچھلے مہینے دونوں بہنوں نے مل کر اپنے جہیز کے لیے بیڈ شیٹس پر سندھی کڑھائی کی تھی۔ ایسی خوب صورت چادریں تیار کی ہیں کہ دیکھتے رہ جاؤ۔ مارکیٹ سے خریدنے جاتی تو ہزاروں خرچ کرنے پڑتے پر دونوں نے مل کر چند سو میں کام دکھا ڈالا۔ اب ارم دوسری بیڈ شیٹس پر پینٹنگ کر رہی ہے۔ وہ بھی انشاء اللہ بہت خوب صورت بنیں گی۔ حشمت بھائی اور بھابی جن امیدوں کے ساتھ میری بیٹیوں کو اپنی بہوئیں بنا کر لے جا رہے ہیں انہیں اس سے کہیں بڑھ کر ہی پائیں گے۔ ان کے بیٹے اگر ہیرا ہیں تو میری بیٹیاں بھی کم نہیں ہیں۔ ایسی خوب صورت، پڑھی لکھی، سلیقہ شعار اور ادب تہذیب والی لڑکیاں اگر وہ چراغ لے کر بھی ڈھونڈتے تو اتنی آسانی سے نہ ملتیں جیسے انہیں مل گئی ہیں۔" جمیلہ کے لہجے میں ایک ایسی ماں کا فخر تھا جس نے بھرپور توجہ اور محنت سے بیٹیوں کو پروان چڑھایا ہو اس کی بات سن کر افضل علی مسکرا

دیے اور اعتراف کرنے کے انداز میں بولے۔

"تم ٹھیک کہتی ہو جمیلہ! تم نے واقعی بڑی محنت سے بچیوں کی پرورش کر کے انہیں کندن بنا ڈالا ہے۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ جتنی خوبیاں میں اپنی بیٹیوں میں چاہتا تھا۔ وہ سب بلکہ ان سے بھی بڑھ کر تم نے ان کے اندر جمع کر دی ہیں لیکن پھر بھی اللہ کے احسان کو مت بھولو۔ اس کا کرم نہ ہوتا تو میری اور تمہاری ساری کی ساری محنت ضائع بھی جا سکتی تھی یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اچھی تعلیم و تربیت کے باوجود ہمیں بچیوں کے لیے مناسب بر ڈھونڈنے میں دشواری پیش آتی۔ اس لیے شکر بہت ضروری ہے۔" ان کا لہجہ ہمیشہ کی طرح ٹھہرا ہوا اور میٹھا تھا۔ بیوی کو ٹوکتے ہوئے بھی اس میں ذرا برابر تلخی نہیں اتری تھی۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ افضل علی کی یہ میٹھی زبان ہی ہے جس کی وجہ سے اس کی پرچون کی چھوٹی سی دکان محلے کی دوسری دکانوں کے مقابلے میں زیادہ چلتی ہے ویسے زبان کی مٹھاس کے علاوہ لوگ اس کی دیانت داری سے بھی متاثر ہوتے تھے۔ وہ نہ تو ناپ تول میں ہیرا پھیری کرتا تھا اور نہ ہی ناقص مال مہنگے داموں بیچنے کا عادی تھا۔ جب ہی مناسب منافع کے ساتھ کی جانے والی اس کی دکانداری میں اللہ نے بڑی برکت ڈال رکھی تھی۔

"اللہ میری توبہ جو میں غرور کروں، وہ تو بس اپنی بچیوں کا سوچ کر ان پر پیار آ گیا تھا ورنہ میری کیا اوقات کہ میں خود کو یا اپنی بچیوں کو کسی سے اعلیٰ سمجھنے کی غلطی کروں۔ وہ جو ہیں اور جیسی بھی ہیں اللہ کے کرم سے ہیں۔" جمیلہ فوراً توبہ کرنے لگیں۔

"واقعی اللہ کا کرم ہے کہ ہماری بچیاں اتنی اچھی ہیں اور اتنے ہی اچھے لوگوں میں ان کا رشتہ جڑ گیا ہے۔ اگر رشتے اتنے اچھے نہیں ہوتے تو میں ہامی بھرنے میں اتنی جلدی کرنے کے بجائے انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیتا۔ خاص طور پر مجھے ارم کے ڈاکٹر بننے کی خواہش پوری کرنے کا بہت شوق تھا۔ فرسٹ ایئر میں اس کے نمبر بھی بہت اچھے آئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ انٹر میں میڈیکل کے لیے میرٹ بنا لے گی لیکن تم تو جانتی ہو کہ میرے دل میں بچیوں کے لیے جتنی خواہشات ہیں ان میں سے سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ ان کے رشتے کسی شریف اور عزت دار گھر میں ہو جائیں اور وہ اپنے اپنے گھروں میں سکون کی زندگی گزاریں۔ ارم کے ڈاکٹر نہ بن سکنے کی خلش تو رہے گی میرے دل میں۔ شاید اسے بھی مجھ سے شکایت ہو لیکن میں اتنے بہترین رشتے کو ٹھکرانے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔" وہ کچھ ملول سے نظر آنے لگے۔

"اتنی سی بات کو دل پر مت لیں۔ پہلے ارم کا رزلٹ آنے دیں۔ اگر اس کے نمبر بہت اچھے آئے تو آپ حشمت بھائی سے بات کر دیکھیے گا۔ وہ اتنے اچھے اور سمجھدار آدمی ہیں ہو سکتا ہے ارم کو شادی کے بعد پڑھنے کی اجازت دے دیں۔ عاصم خود پڑھا لکھا ہے۔ بیوی ڈاکٹر بنے گی تو وہ اسے بھی اچھا لگے گا آگے چل کر دونوں میاں بیوی مل کر زندگی کی گاڑی اور بھی اچھے طریقے سے چلا سکیں گے بلکہ میں تو صنم کے لیے بھی بات کروں گی۔ وہ پڑھنے میں ارم جتنی اچھی نہیں تو زیادہ بری بھی نہیں ہے اسے انٹر کے بعد بی ایس سی نہ سہی لیکن پرائیویٹ بی اے تو کروا ہی سکتے ہیں حشمت بھائی۔ دونوں سگی بہنیں ہیں اس لیے خوشی سے ایک دوسرے کی مصروفیت کے حساب سے گھریلو کاموں کی سیٹنگ بھی کر لیں گی اور گھر میں روایتی جیٹھانی، دیورانی والی چخ چخ نہیں رہے گی۔" جمیلہ انہیں ملول دیکھ کر فوری طور پر ان کی دل جوئی کے لیے آگے بڑھیں اور بہت دنوں سے دل میں دبی خواہش بھی زبان پر لے آئیں۔ ان کی بات سن کر افضل علی سوچ میں پڑ گئے۔

"کیا ہوا، آپ کچھ بولتے کیوں نہیں؟" جمیلہ کو بے چینی ہوئی۔

"میں سوچ رہا تھا کہ تمہارا خیال تو برا نہیں لیکن معلوم نہیں کہ حشمت اور بھابی اسے پسند کریں گے یا نہیں۔" انہوں نے قدرے تذبذب سے جواب دیا۔

"آپ بات تو کر کے دیکھیں۔ آگے اللہ مالک ہے۔" جمیلہ نے ان کا حوصلہ بڑھایا۔

"ٹھیک ہے میں بات کروں گا لیکن یاد رکھو کہ میں ان پر زور ہرگز نہیں دوں گا، وہ خوشی سے راضی ہو گئے تو اچھی بات ورنہ آگے بچیوں کا نصیب۔ میں صرف اس ایک ایشو پر ان کے اتنے اچھے رشتے گنوانے کی غلطی نہیں کر سکتا۔" افضل علی نے حتمی لہجے میں بیوی کو فیصلہ سنایا۔

"میں بھی کب ایسا چاہتی ہوں لیکن بات کرنے

میں کوئی حرج بھی نہیں۔ آدمی کوشش کرتا ہے تب ہی تو اللہ مدد بھی کرتا ہے۔ اللہ سے مدد کی آس پر بات کر دیکھیے۔ آپ سے بڑھ کر کون یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ انسان کی کوشش میں خلوص ہو تو اللہ خود اس کا ساتھ دیتا ہے۔“ جمیلہ کی بات ان کے دل کو لگی۔ واقعی اللہ کی مدد اور اپنی نیک نیتی کے سہارے ہی تو وہ آج تک زندگی گزارتے رہے تھے پھر اس وقت کیسے ہمت ہار دیتے۔

”ٹھیک ہے، میں بات کروں گا حشمت سے۔“ اس بار انہوں نے ذرا مضبوطی سے یہ جملہ کہا جسے سن کر جمیلہ طمانیت سے مسکرا دیں۔ وہ ماں تھیں جانتی تھیں کہ ارم نے فرمانبردار بیٹی کی طرح والدین کے فیصلے پر بنا کسی بحث کے سر تو جھکا دیا ہے لیکن اندر سے وہ تھوڑی افسردہ ہے کہ اپنی محنت اور قابلیت کے باوجود حسبِ خواہش ڈاکٹر بننے سے محروم رہ جائے گی۔ انہوں نے بیٹی کے کہے بغیر از خود اس کا مقدمہ لڑنے کا فیصلہ کر لیا اور پُرامید تھیں کہ بیٹی کے سامنے سرخرو بھی رہیں گی۔

***

فضا میں ظہر کی اذان کی آواز بلند ہوتے ہی ہاشو نے اپنے سامنے پڑے کاسے کو اٹھایا اور قریب کھڑی چھولوں کی ریڑھی کی طرف بڑھا۔

”ہاں بھئی ہاشو چلا مسجد کی طرف؟“ ریڑھی والے نے اسے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر مسکرا کر پوچھا۔

”ہاں حمید بھائی، میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں جب تک تم یہ اپنے پاس رکھ لو۔“ اس نے اپنا کاسہ اس کی طرف بڑھایا جس میں گنتی کے چند ہی سکے تھے، وہ بھی ایسے مہربانوں کی وجہ سے جو بنا مانگے ایک نوعمر لڑکے کے کاسے میں کچھ نہ کچھ ڈال دیتے تھے ورنہ اس سے تو منہ کھول کر کسی سے مانگا ہی نہیں جاتا تھا۔ باپ کی ڈانٹ پھٹکار کے ڈر سے کبھی جرأت بھی کرتا تو آواز ساتھ چھوڑ دیتی اور خالی ہلتے لبوں کی صدا کسی راہ گیر تک نہ پہنچ پاتی۔

”ٹھیک ہے تو جا، میری روزی روٹی کے لیے بھی دعا کرنا۔“ حمید بھائی نامی چھولے فروش نے کمالِ مہربانی سے اس کا کاسہ لے کر اپنی ریڑھی پر ایک جانب رکھ لیا اور اس سے دعا کے لیے کہا۔ ہاشو کے نماز کے لیے روانہ ہوتے وقت کاسہ اپنے پاس رکھوانے پر وہ ہر بار اس سے یہ فرمائش ضرور کرتا تھا۔ خود اسے کبھی نماز پڑھنے جانے کی توفیق نہیں ہوتی تھی۔ بقول اس کے ظہر کا وقت دھندے کے لیے سب سے موزوں ہوتا تھا کیونکہ اس وقت اسکول اور کالج کی چھٹی ہوتی تھی اور وہاں سے نکلنے والے طالب علم گھروں کو جاتے ہوئے اس کی چٹخارے دار چھولوں کی چاٹ کھاتے ہوئے یا پارسل بنوا کر لے جاتے تھے۔ ان اوقات میں اس کی آمدنی کا دوسرا اہم ذریعہ وہ مل مزدور تھے جو لنچ ٹائم میں باہر آتے تھے اور جیب میں زیادہ رقم نہ پا کر کسی ہوٹل کے بجائے اس کی ریڑھی کا رخ کرتے تھے اور ریڑھی کے قریب رکھی لکڑی کی بینچوں پر بیٹھ کر ان چھولوں سے اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ یوں حمید بھائی کے لیے کسی طور ممکن نہیں تھا کہ وہ دھندے کے ایسے عروج کے وقت اپنی ریڑھی چھوڑ کر نماز کے لیے چل پڑتا چنانچہ وہ خود روزی روٹی کمانے میں گم ہو کر اس کی بڑھوتری کی دعا ہاشو کے ذمے لگا دیتا تھا۔ ہاشو کے لیے بھی اس کی اتنی مہربانی کافی تھی کہ وہ اس کا کاسہ بغیر کسی خیانت کے اپنے پاس رکھ لیتا تھا ورنہ اس کاسے کے ساتھ وہ بھلا مسجد کیسے جاتا حالانکہ مسجد میں سب اپنے، اپنے حساب سے مانگنے ہی جاتے ہیں۔ کسی کو گناہوں سے نجات چاہیے ہوتی ہے تو کوئی جنت کا طلب گار ہوتا ہے کسی کو بچوں کی اعلیٰ تعلیم کی فکر ہوتی ہے تو کوئی بیٹیوں کے لیے اچھے بر کا خواہش مند ہوتا ہے کسی کو ملازمت میں ترقی کی خواہش ہوتی ہے تو کوئی اپنے کاروبار کو دن دگنا رات چوگنا پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہے لیکن یہ سارے عزت دار منگتے تھے جو اپنے درمیان ایک کاسہ بردار پیشہ ور منگتے کو دیکھ کر شاید برا مناتے اور ناک بھوں چڑھاتے ہوئے اس کے ساتھ کھڑے ہونے سے انکار کر دیتے یا شاید ایسا نہ ہوتا لیکن ہاشو کے اپنے اندر موجود احساسِ شرمندگی اسے کاسے سمیت مسجد کا رخ نہیں کرنے دیتا تھا۔

مسجد میں پہنچ کر اس نے وضو خانے کا رخ کیا اور رگڑ رگڑ کر اپنے اعضا دھوتے ہوئے وضو کرنے لگا، وہ کم عمر تھا اور بہت کچھ نہ تو جانتا تھا اور نہ ہی سوچ سکتا تھا پھر بھی اس کے اندر ایک ایسی روح تھی جو اسے اس کے پیشے پر شرمندہ کرتی رہتی تھی اور وہ رگڑ رگڑ کر وضو کرتے ہوئے انجانے میں اپنے بدن سے گداگری کی دھول بہاتا رہتا تھا۔ اتنی محنت اور وقت لگا کر کیے جانے والے وضو کے نتیجے میں اسے تھوڑا بہت اطمینان ہو جاتا تھا کہ وہ کسی کو صورت سے فقیر نہیں لگتا ہوگا۔ ہاں لباس کے لیے وہ مجبور تھا۔ پیوند لگا قدرے میلا لباس اسے نماز کے لیے موزوں تو نہ لگتا تھا لیکن اس کا اس کے پاس کوئی نعم البدل بھی نہیں تھا نہ ہی جسم کی طرح وہ اسے وضو خانے میں دھو کر اجلا کر سکتا تھا اسی لیے اس پر گزارہ کرنے پر اکتفا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں اس کے پاس ایک چھوٹی سی ڈھارس یہ بھی تھی کہ مسجد کے عین مقابل موجود آٹو ورکشاپ سے نماز کے لیے آنے والے چند لڑکوں کے لباس اس سے بھی زیادہ میلے چیکٹے اور بوسیدہ ہوتے تھے اور وہ خود کو ان محنت کش لڑکوں کے برابر نہ سمجھنے کے باوجود اس حد تک تو مطمئن تھا کہ دیکھنے والے نمازی اسے بھی کوئی محنت کش ہی سمجھتے ہوں گے۔

وضو کر کے وہ نماز کے ہال میں پہنچا تو وہاں صف بندی کی جا رہی تھی۔ وہ بھی خاموشی سے جا کر پچھلی صف میں شامل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جماعت قائم ہو گئی اور وہ پورے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھنے لگا۔ نماز کے اختتام پر اس نے ہمیشہ کی طرح پورے انہماک سے دعا مانگی۔ اس دعا میں سرِفہرست یہی دعا تھی کہ اللہ اسے ذلت کی اس زندگی سے نجات دلائے اور اس کے ماں باپ کے دل میں ایسا خیال ڈال دے کہ وہ گداگری کا پیشہ چھوڑ کر کسی باعزت پیشے سے وابستہ ہو جائیں۔ یہ دعا مانگتے ہوئے اس کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آتا تھا کہ اس کے ماں باپ نسلوں سے بھکاری چلے آ رہے ہیں اور ان کی رگوں میں دوڑتا بھکاریوں کا خون کبھی کسی باعزت پیشے کی خواہش نہیں کرتا بلکہ اس خواہش پر وہ خود ہاشو کی بھی درگت بنا سکتے ہیں۔

دعا سے فارغ ہونے کے بعد اس نے مسجد کے برآمدے کا رخ کیا جہاں حسبِ معمول نورانی چہرے والے وہ صاحب براجمان ہو چکے تھے۔ سر اور داڑھی کے سفید بالوں کے ساتھ سفید اجلے لباس میں رہنے والے وہ بزرگ اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ اس نے انہیں یہیں اسی مسجد میں ہی دیکھا تھا۔ اس روز وہ اتفاق سے پہلی بار مسجد آیا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ اس کے سوال نہ کرنے اور دستِ طلب دراز نہ کرنے کی عادت (اس کے باپ کے بقول نکمے پن) کے باعث اسے تین دن سے بالکل بھی بھیک نہیں ملی تھی اور اس نقصان پر جامو نے اس کی ٹھیک ٹھاک ٹھکائی لگائی تھی۔ بے دردی سے لگائی گئی اس ٹھکائی

کے نتیجے میں اس کا جسم رات بھر پھوڑے کی طرح دکھتا رہا تھا اور صبح بخار بھی ہو گیا تھا اس کے باوجود جامو نے رحم کھائے بغیر اسے اس کے ٹھکانے پر پہنچا دیا۔ وہاں بیٹھ کر اس نے بہت کوشش کی کہ کسی سے کچھ مانگ سکے لیکن اول تو اس کی آواز ہی نہیں نکلی اور اگر جو اس نے تھوڑی بہت کوشش سے آواز نکالی بھی تو سامنے والا ”معاف کرو“ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ نتیجے میں دوپہر تک بھی اس کا کاسہ بالکل خالی تھا اور وہ خوف زدہ تھا کہ اگر آج بھی خالی ہاتھ گیا تو کل رات سے بھی زیادہ مار پڑے گی کیونکہ اس کا باپ اس کی وجہ سے مسلسل نقصان میں جا رہا تھا اور سردار کو اس کے حصے کی رقم بھی اسے اپنی دیہاڑی میں سے دینی پڑ رہی تھی۔ وہ اسی خوف کے عالم میں اپنی جگہ پر گھٹنوں میں منہ دیے بیٹھا تھا کہ اذان کی آواز سنائی دی اور پہلی بار اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ جس اللہ کے نام پر لوگوں سے سوال کرتا ہے کیوں نہ اسی سے سوال کر کے دیکھے۔ بس یوں وہ مسجد پہنچ گیا۔ نماز پڑھنے کا سلیقہ نہیں تھا بس دوسروں کی دیکھا دیکھی اٹھک بیٹھک کرتا رہا اور جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے کی باری آئی تو بلک بلک کر اللہ سے یہی دعا کرتا رہا کہ آج اسے اتنی رقم مل جائے کہ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑیں۔ اپنے استغراق میں اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے اور اس کی آواز کتنی بلند ہے۔ ہوش اس وقت آیا جب کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے ہلایا اور اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھتا اس کے ہاتھ پر کئی نوٹ رکھے جا چکے تھے۔ اس نے آنسوؤں کی دھند میں نورانی چہرے والے ان بزرگوار کا چہرہ دیکھا جو اس کے لیے اس وقت رحمت کا فرشتہ بن کر آئے تھے۔

”حوصلے سے کام لو بیٹا! مجھے نہیں معلوم کہ تمہیں اس وقت کتنے روپوں کی ضرورت ہے بس میری جیب میں جتنی رقم تھی میں نے تمہیں دے دی۔“ انہوں نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے نرمی سے کہا تو وہ شرمندہ ہو گیا۔ وہ بغیر گنے بھی بتا سکتا تھا کہ اس کے ہاتھ میں جو رقم ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو وہ دھندا اچھا ہو جانے کی صورت میں اپنے باپ کے ہاتھ پر لے جا کر رکھتا ہے۔

”یہ بہت سارے روپے ہیں۔ مجھے اتنے سارے

نہیں چاہیے تھے۔'' اس نے انہیں رقم واپس کرنے کی کوشش کی تھی۔

''تم نے اللہ سے مانگے تھے اور وہ بندے کو اس کی طلب سے زیادہ ہی دیتا ہے۔ اس لیے تم سارے رکھ لو۔'' انہوں نے اس کا شانہ تھپکا اور مزید کچھ سنے بغیر وہاں سے چلے گئے۔ اس روز وہ مسجد سے واپس آیا تو یہ عقلمندی کی کہ حمید بھائی سے بندھی ہوئی رقم کی جگہ کھلے پیسے لے کر اپنے کاسے میں ڈال لیے وہ بھی اتنے جو اس کی اوسط دیہاڑی کے لگ بھگ تھے۔ اس دن کے بعد سے اس کا معمول بن گیا کہ وہ ہر روز پابندی سے ظہر کی نماز کے لیے جانے لگا۔ نورانی چہرے والے وہ بزرگ بھی پابندی سے اس مسجد میں نماز کے لیے آتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ نماز کے بعد مسجد میں ہی رکے رہتے اور برآمدے میں بیٹھ کر بچوں کو اچھی اچھی باتیں بتاتے۔ ہاشو بھی ان کی یہ باتیں سننے کے لیے وہاں بیٹھنے لگا۔ قدرت نے اسے ایک روشن دل پہلے ہی عطا کر رکھا تھا علم کی روشنی ملی تو مزید جگمگانے لگا اور دماغ میں اٹھتے بہت سے سوالوں کے جواب بھی ملنے لگے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ جیسے جیسے اندر کی روشنی بڑھتی گئی اپنے ماحول اور طرزِ زندگی سے مزید گھٹن محسوس ہونے لگی۔ وہ پہلے ہی مطمئن نہیں تھا کچھ دیر کے لیے ایسی نکھری صحبت میں بیٹھنے لگا تو بیزاری اور بھی بڑھتی گئی۔ بیزاری اور گھٹن کی اس فضا میں ایک دن ایسا پتھر گرا کہ اس کے جسم و جاں لرز اٹھے۔

اس روز بھی وہ حسبِ معمول ان بزرگ کی محفل میں، جنہیں سب لوگ صوفی صاحب کہتے تھے بیٹھا تھا کہ انہوں نے ایک ایسا موضوع چھیڑ دیا جو اس کے دل میں ایک پھوڑے کی طرح پکتا رہتا تھا۔ صوفی صاحب کہہ رہے تھے۔

''مجھے تم بچوں کو دیکھ کر خوشی بھی ہوتی ہے اور دکھ بھی۔ دکھ اس بات کا کہ غربت کی مجبوری نے تمہیں اتنی کم عمری میں مزدوری کی مشقت میں مبتلا کر دیا ہے اور تم لوگ صاف ستھرے اجلے یونیفارم میں بیگ لٹکائے اسکول جانے کے بجائے صبح اٹھ کر روزی روٹی کے لیے نکل پڑتے ہو لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ تم اپنی محنت کی کمائی کھاتے ہو اور چور اچکے یا بھیک منگے نہیں ہو۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اپنے ہاتھ کی محنت سے روزی کمانے والے لوگ بہت محبوب تھے۔ چوری چکاری کرنے والوں کو تو خیر دنیا کے ہر مذہب اور قانون میں قابلِ سزا سمجھا ہی جاتا ہے لیکن ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے والوں کو بھی سخت ناپسند فرماتے تھے۔'' مسجد میں صوفی صاحب کا مختصر دورانیے کا درس سننے کے لیے رکنے والے بچوں کی اکثریت وہ تھی جو مختلف ورکشاپس، چائے خانوں یا دیگر دکانوں وغیرہ پر کام کرتے تھے اس لیے وہ اسی حوالے سے گفتگو بھی کر رہے تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ ان کا درس سننے والوں میں جو ایک بہت روشن چہرے والا لڑکا بیٹھتا ہے اسے اس موضوع کے چھڑنے سے کیسی تکلیف پہنچی ہے وہ تو بس اپنی دھن میں حسبِ معمول روانی سے بولتے جا رہے تھے۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت تھی کہ آپ کبھی کسی سوالی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے تھے لیکن آپ کو یہ عمل پسند نہیں تھا اور فرماتے تھے کہ جو لوگوں سے مانگتا رہتا ہے، اپنے مال کے بڑھانے کو تو وہ چنگاریاں مانگتا ہے پھر چاہے کم لے یا زیادہ لے۔'' ایک اور حدیث مبارکہ میں مانگنے والوں کے لیے بڑے سخت الفاظ استعمال ہوئے ہیں فرمایا۔ ''آدمی ہمیشہ لوگوں سے سوال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ قیامت کا دن آئے گا اور اس کے منہ پر ایک بوٹی گوشت کی نہ ہوگی۔'' میرے پیارے بچوں ذرا غور کرو کہ مانگنے والے کے لیے آنحضرتؐ نے کیسی وعیدیں سنائی ہیں۔ ایسا شخص روزِ حشر جب اپنے اللہ کے حضور کھڑا ہوگا تو اس کے ہاتھ ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں آئے گا جبکہ اس کے مقابلے میں آپ محنت مزدوری کرنے والوں کو بہت پسند فرماتے تھے۔ آپ کا فرمان ہے کہ اگر کوئی لکڑی کا گٹھا لا دے اپنی پیٹھ پر اور اس کو بیچے تو یہ اس کے حق میں بہتر ہے سوال کرنے سے کسی شخص سے، کہ معلوم نہیں کہ وہ دے یا نہ دے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ مجھے تمہیں دیکھ کر دکھ بھی ہوتا ہے اور خوشی بھی لیکن میں پھر بھی کہتا ہوں کہ تم خوش نصیب ہو کہ تمہاری تکلیفیں اور دکھ اس فانی دنیا کی عارضی زندگی کے لیے ہیں اور آخرت میں تم اپنے رب اور رسول کے سامنے سرخرو کھڑے ہوگے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ آدمی اپنے نبی ﷺ کے پسندیدہ افراد میں شامل ہو

کیونکہ جسے رسولؐ پسند کرتے ہیں اسے اللہ بھی پسند کرتا ہے اور اللہ نے اپنے پسندیدہ بندوں کے لیے نعمتوں بھری جنت کا وعدہ کر رکھا ہے۔'' صوفی صاحب نہ جانے کیا کچھ بولتے جا رہے تھے لیکن ہاشو تو بالکل سن پڑ چکا تھا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والا معاملہ اس کا اس وقت تھا۔ درس ختم ہو گیا۔ سب لڑکے اٹھ کر اپنے اپنے کاموں پر روانہ ہو گئے لیکن وہ جہاں کا تہاں بیٹھا رہ گیا۔

''کیا بات ہے بیٹا تم ابھی تک یہیں بیٹھے ہو۔ کوئی کام ہے کیا؟'' صوفی صاحب نے اس کے قریب آ کر ہاشو کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تو وہ ہوش میں آیا۔

''کچھ نہیں صوفی صاحب!'' وہ کہتا ہوا اٹھ کر مسجد سے باہر نکل گیا لیکن زبان سے ''کچھ نہیں'' کہنے سے کیا ہوتا تھا ہوا تو بہت کچھ تھا۔ اس کے اندر ایک آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ وہ آندھیوں کی زد میں تھا اور اندر ہی اندر اپنی بدنصیبی پر ماتم کر رہا تھا۔ اسے صدمہ تھا کہ وہ کیسی بدترین زندگی گزار رہا ہے جسے گزارتے ہوئے نہ تو اس دنیا میں خوش ہے اور نہ ہی جس کے اختتام پر اس کے لیے کوئی خوش خبری موجود ہے۔ اپنی اس تباہ حال کیفیت میں وہ خالی ہاتھ ہی گھر واپس لوٹ گیا۔ خالی ہاتھ لوٹنے کے جرم میں اسے باپ سے بے بھاؤ کی سننے کے ساتھ ساتھ تھوڑی مار بھی کھانی پڑی لیکن اس پر اثر نہیں ہوا اور وہ اپنی اسی سکتہ زدہ سی کیفیت میں بغیر کچھ کھائے پئے ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ سویرا ہونے تک ایک فیصلہ ہو چکا تھا۔ صبح وہ گھر سے روانہ ہوا تو پیٹ بے شک خالی تھا لیکن دل نئے عزائم اور امنگوں سے بھرا ہوا تھا۔

***

''تم کتنی بورنگ ہو یار جب دیکھو کتابوں میں گھسی رہتی ہو۔'' صنم نے ارم کے قریب دھپ سے بیٹھتے ہوئے شکوہ کیا۔

''کتابوں میں گھس کر نہ بیٹھوں تو اور کیا کروں؟'' اس نے کتاب پر سے نظر اٹھائے بغیر کہا۔

''موسم کو انجوائے کرو۔ دیکھو تو سہی کتنے غضب کا موسم ہو رہا ہے لیکن تم اپنی کتابوں سے سر اوپر اٹھاؤ گی تو کچھ پتا چلے گا ناں۔'' صنم نے اپنے اسٹیپ کٹنگ بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے منہ پھلایا۔

''موسم کا کیا ہے۔ موسم تو آتے جاتے رہتے ہیں، زندگی رہی تو انشاء اللہ ہم ایسے کئی موسم دیکھ لیں گے لیکن یہ وقت لوٹ کر آنے والا نہیں ہے۔ میں اس وقت کو اِدھر اُدھر کی تفریحات میں ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ کتنے تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں امتحانوں میں۔ میں نہیں چاہتی کہ ذرا سی بے پروائی سے میرا میڈیکل کے لیے میرٹ بنا رہ جائے بلکہ میرا تو مشورہ ہے کہ تم بھی دن رات محنت کرو تاکہ فرسٹ ایئر میں جو کمی رہ گئی ہے وہ پوری ہو جائے۔ سوچو تو کتنا اچھا لگے گا جب ہم دونوں بہنیں ایک ساتھ میڈیکل کالج جایا کریں گی۔'' وہ اپنے سے چند منٹ چھوٹی بہن کو نصیحتیں کرنے لگی۔

''یہ شیخ چلی کے منصوبے رہنے دو اور حقیقت کی دنیا میں آؤ۔ ہمیں ایک ساتھ جانا تو ہے لیکن میڈیکل کالج نہیں بلکہ دلہن بن کر حشمت انکل کے گھر۔ آنٹی کے ارادے بڑے نیک ہیں اور وہ شادی میں سال چھ مہینے سے زیادہ کا وقت نہیں لینے والی۔ ایسی صورت میں ہم کیسے آگے پڑھائی جاری رکھ سکتے ہیں؟ میں نے تو سوچا ہے کہ امتحان سے فارغ ہو کر ووکیشنل ٹریننگ سینٹر میں داخلہ لے لوں گی۔ آنٹی سگھڑ اور سلیقہ شعار بہو پا کر یقیناً بہت خوش ہوں گی۔'' اس نے اپنے ازلی شوخ لہجے میں بہن کو مستقبل کی منصوبہ بندی سے آگاہ کیا۔

''ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔ میرے لیے تو یہ اچھا ہی ہوگا۔ شادی کے بعد تم شوق سے امورِ خانہ داری سنبھالنا اور میں آرام سے پڑھتی رہوں گی۔ امی بتا رہی تھیں کہ ان کی حشمت انکل اور آنٹی سے بات ہو گئی ہے۔ شادی کے بعد اگر ہم دونوں بہنیں چاہیں گی تو آرام سے پڑھتی رہیں گی۔ انکل یا آنٹی کو اس پر بالکل بھی اعتراض نہیں ہوگا۔'' اس نے چہرے پر آجانے والی بالوں کی لٹ کان کے پیچھے اُڑستے ہوئے اطمینان سے جواب دیا تو صنم نے پہلے تو بُرا سا منہ بنایا پھر زور زبردستی سے کام لیتے ہوئے اس کے سامنے کھلی کتاب کو بند کرتے ہوئے بولی۔

''آئندہ کی باتیں آئندہ دیکھی جائیں گی لیکن... فی الحال میں تمہیں اپنا اتنا خوب صورت دن برباد نہیں کرنے دوں گی۔ بند کرو اپنی یہ دادی اماؤں والی خشک نصیحتیں اور چھوڑو ان کتابوں کو۔''

''کیا ہے یار، ذرا سے بادل ہی تو چھائے ہیں آسمان پر اور تم نے یوں آسمان سر پر اٹھا لیا ہے جیسے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ برسنے تو دو ان بادلوں کو پھر امی سے کہہ کر پکوڑے اور سوجی کی میٹھی ٹکیاں بنوائیں گے اور ایف ایم پر گانے سنتے ہوئے چائے کے ساتھ انجوائے کریں گے۔'' اس نے اپنی جان چھڑانے کی ایک اور کوشش کی۔

''رہنے دو تم اپنی اس دقیانوسی انجوائے منٹ کو۔ پیدائش سے لے کر اب تک ہم اسی طرح تو برسات کو انجوائے کرتے آ رہے ہیں اور سچ پوچھو تو میرا اس طریقے سے دل بھر گیا ہے۔'' صنم نے چہک کر بولتے ہوئے بہن کی بات سے اختلاف کیا۔

''تو تمہارے ذہن میں انجوائے منٹ کا کون سا جدید طریقہ آگیا ہے ذرا مجھے بھی بتا دو۔ میں تو کم از کم اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ نہیں جانتی۔'' اس بار وہ ذرا سی خفا ہوئی۔

''طریقہ میرے نہیں راحم کے ذہن میں ہے۔ اس کا فون آیا تھا تھوڑی دیر پہلے... کہہ رہا تھا موسم بہت اچھا ہو رہا ہے تمہیں باہر گھومنے چلتے ہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، میں ارم کو راضی کرتی ہوں تم عاصم بھائی سے بات کرو تو چاروں ساتھ مل کر چلیں گے۔'' اس نے اپنا پروگرام بتایا تو ارم کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

''تمہارا دماغ تو صحیح ہے۔ امی نے تمہارا یہ پروگرام سنا تو سر توڑ دیں گی۔ اس قسم کی آزادی کی گنجائش نہیں ہے ہمارے ماحول میں۔'' حیرت کے فوری جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد اس نے صنم کو لتاڑا۔

''امی کو بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم امی سے شاہدہ کے گھر جانے کا بہانہ کر کے نکلیں گے اور گھومنے کے بعد دو تین گھنٹوں میں واپس گھر آ جائیں گے۔'' وہ نہ صرف پورا پروگرام طے کیے بیٹھی تھی بلکہ اپنی جگہ مطمئن بھی تھی۔

''یہ کیا بکواس ہے۔ اب ہم ذرا سی تفریح کے لیے اپنے ماں باپ کے اعتماد کو دھوکا دیں گے کیا؟'' وہ سچ مچ طیش میں آ گئی۔ جڑواں ہونے کے باوجود اس کے اور صنم کے مزاج اور خیالات میں بڑا فرق تھا۔ وہ جتنی سنجیدہ طبیعت اور والدین کی فرمانبردار تھی، صنم اتنی ہی شوخ اور بے پروا۔ اپنے اس مزاج کے باعث وہ کبھی کبھار بغاوت کا مظاہرہ بھی کر جاتی تھی جیسا کہ اس نے منگنی کے

بعد راحم کے ساتھ ٹیلی فونک رابطہ رکھنے میں اپنی اقدار و روایات کا بالکل خیال نہیں کیا تھا اور وہ اور راحم اکثر ہی چوری چھپے ایک دوسرے سے بات کرتے رہتے تھے۔ ارم نے اس بات کو زیادہ اچھا نہ سمجھنے کے باوجود خاموشی اختیار کر لی تھی کہ وہ کالج میں دیکھتی ہی رہتی تھی کہ لڑکیاں کس طرح اپنے منگیتروں بلکہ بوائے فرینڈز تک کے ساتھ ہر وقت رابطے میں رہتی ہیں۔ یہاں تو پھر بھی کھلم کھلا آزادی کے بجائے چوری چھپے کا قصہ تھا اور ایک طرح سے بڑوں کا حجاب حائل تھا۔ ویسے اسے اندازہ تھا کہ امی کو صنم کی اس حرکت کا علم ہے اور وہ صرف اس وجہ سے صرفِ نظر کیے ہوئے ہیں کہ کچھ عرصے بعد بالآخر اس کی راحم سے شادی ہونی ہی ہے لیکن اس طرح باہر گھومنے پھرنے جانے کی تو وہ ہرگز بھی اجازت نہیں دے سکتی تھیں۔ یہی بات اس نے صنم کو بھی سمجھانے کی کوشش کی۔

''فضول کی اخلاقیات ہیں جو شاید پچھلی صدی میں تو اچھی سمجھی جاتی ہوں لیکن اب ان کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آج کے دور میں شادی سے پہلے لڑکے، لڑکی کا آپس میں بات چیت کرنا اور ساتھ ساتھ گھومنا پھرنا بالکل بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوتا ہے کہ پہلے سے ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع مل جاتا ہے، اس طرح شادی کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے میں آسانی رہتی ہے۔'' ماحول اور تربیت ایک ہونے کے باوجود صنم کے خیالات اس سے یکسر مختلف تھے کیونکہ وہ گھر سے زیادہ باہر کی دنیا سے متاثر تھی۔

''اس موضوع پر میں تمہارے ساتھ ایک لمبی بحث کر سکتی ہوں لیکن فی الحال اس کی فرصت نہیں ہے۔ تم راحم کو فون کر کے منع کر دو کہ ہم میں سے کوئی بھی اس طرح گھر سے باہر نہیں نکل سکتا۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہتے ہوئے ایک بار پھر اپنی کتاب کھول لی۔

''میں ہرگز بھی راحم کو فون کر کے منع نہیں کروں گی اور نہ ہی تمہارے ساتھ بحث کرنے میں وقت ضائع کروں گی۔ تم یہاں بیٹھ کر اپنی کتابوں میں سر کھپاؤ۔ میں جا رہی ہوں انجوائے کرنے۔'' دوسری طرف اس نے بھی اپنا دو ٹوک فیصلہ سنایا اور الماری کھول کر اپنے کپڑے نکالنے لگی۔ ارم نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ اب ضدی صنم اپنے ارادے سے ہرگز بھی باز نہیں آئے گی اور اسے روکنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ وہ امی کو اس کے ارادے سے آگاہ کر دیتی لیکن ایسا کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ ایسا کرنے کی صورت میں جہاں صنم اس سے سخت خفا ہوتی وہیں امی کی نظروں میں بھی معتوب ٹھہرتی۔ اسے پہلے ہی یہ شکوہ رہتا تھا کہ امی ارم کو اس سے زیادہ چاہتی ہیں۔ موجودہ حالات میں وہ اسے کچھ برا بھلا کہتیں تو وہ اپنی غلطی کو سمجھے بغیر ماں اور بہن سے خوامخواہ ہی بدگمان ہو جاتی۔ دل میں ابھرتے ان اندیشوں نے اسے لبوں کو سی لینے پر مجبور کر دیا اور وہ بظاہر کتابوں میں گم ہو گئی حالانکہ ذہن اسی میں الجھا ہوا تھا۔ وہ تیار ہو کر اور امی سے شاہدہ کے گھر جانے کا بہانہ بنا کر روانہ ہو گئی تو اس نے بھی کتابیں ایک طرف رکھ دیں اور امی کی مدد کے خیال سے باورچی خانے میں پہنچ گئی۔

''کیا پکانا ہے امی مجھے بتا دیں، میں پکا دیتی ہوں۔'' اس نے ہرا مسالا کاٹتی جمیلہ سے کہا۔

''آلو ابالنے کے لیے رکھے ہیں۔ سوچ رہی ہوں آلو بھرے پراٹھے اور املی کی چٹنی بنا لوں۔ برسات کا موسم ہو رہا ہے اور ایسے موسم میں تمہیں معلوم ہے کہ صنم کو ایسی چیزیں کھانا پسند ہیں۔'' انہوں نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا تو وہ دل میں ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔ امی سے بھلا کیا کہتی کہ اپنی جس لاڈلی کی پسند کا کھانا تیار کر رہی ہیں وہ تو شاید اس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرے کہ راحم کے ساتھ گھومنے کے پروگرام میں کھانے پینے کا شامل ہونا تو لازمی تھا۔

''صنم، شاہدہ کے گھر گئی ہے وہاں سے دو تین گھنٹے سے پہلے کہاں واپس آئے گی ہو سکتا ہے شاہدہ اسے کھانا کھلا کر ہی واپس بھیجے۔ بہر حال آپ ہٹیں، میں بنا لوں گی آپ کی لاڈلی کی پسند کے آلو بھرے پراٹھے۔'' اس نے صنم کی طرف سے پیش بندی کرنے کے ساتھ ساتھ ایک بار پھر انہیں پیشکش کی۔

''رہنے دو بیٹا، میں بنا لوں گی۔ تم اپنی پڑھائی کر لو۔ یہ نہ ہو کہ ابھی کھانا پکانے میں وقت ضائع کر دو اور بعد میں بجلی چلی جائے۔ یہاں تو بارش کی چند بوندیں گرتے ہی سب سے پہلے بجلی غائب ہو جاتی ہے۔'' انہیں احساس تھا کہ وہ پڑھائی کے معاملے میں کتنی سنجیدہ ہے اس لیے اس کی پیشکش قبول کرنے میں ذرا سی متامل ہوئیں۔

"بس امی ابھی دل نہیں چاہ رہا پڑھنے کا۔ تھک گئی ہوں کچھ دیر بعد دیکھوں گی۔" صنم کی وجہ سے اس کا دل یک دم ہی اچاٹ ہو گیا تھا ورنہ اس وقت واقعی وہ بہت جم کر پڑھنے بیٹھی تھی۔

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس سے اچھا تو تم صنم کے ساتھ شاہدہ کے گھر ہی چلی جاتیں۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا اسے اکیلے بھیجنے کو لیکن صرف اس خیال سے اجازت دے دی کہ کہے گی آپ ارم کی خاطر میرا پروگرام خراب کر دیتی ہیں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے ساتھ چلنے کے لیے تمہاری بہت خوشامدیں کی تھیں لیکن تم نے پڑھائی کی وجہ سے انکار کر دیا اور اب سب چھوڑ چھاڑ کر یہاں آ گئی ہو۔ یہ کوئی اچھی حرکت نہیں ہے بیٹا... بہن کے چھوٹے چھوٹے پروگراموں میں اس کا ساتھ دیا کرو۔ اگر ابھی وہ واپس آ جائے اور دیکھے کہ تم پڑھنا چھوڑ کر یہاں کھڑی ہو تو اس کا دل برا ہو گا۔" وہ ذرا سختی سے اسے نصیحت کرنے لگیں۔ اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ صنم کا کیا پروگرام تھا اور اس نے اس کا ساتھ کیوں نہیں دیا۔ بس چپ چاپ کمرے میں واپس لوٹ آئی اور یونہی سامنے کتاب کھول کر بیٹھ گئی لیکن سارا وقت ذہن صنم ہی میں اٹکا رہا۔ کسی کے اسے راحم کے ساتھ دیکھ لینے کا اندیشہ، کوئی حادثہ پیش آنے کا خدشہ اور جانے کیا کیا خیالات تھے جو اس کے ذہن میں آئے چلے جا رہے تھے۔ بارش شروع ہوئی تو اس کا دل اور بھی زیادہ دہلنے لگا اور وہ باقاعدہ صنم کی بخیر و عافیت واپسی کی دعائیں مانگنے لگی۔ دہلنے اور دعائیں مانگنے کا یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب بارش ختم ہونے کے کچھ دیر بعد ہی ہنستی مسکراتی صنم نے بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ گھر میں قدم رکھا۔ اس کی ہنسی کی جلترنگ سن کر جہاں دل کو اطمینان ہوا وہیں اپنا بہت سا وقت برباد ہو جانے پر اسے سخت غصہ بھی آیا۔ آج تو حیرت انگیز طور پر بارش کے باوجود خلافِ معمول بجلی بھی غائب نہیں ہوئی تھی۔ اگر اسے ذہنی یکسوئی حاصل ہوتی تو کافی کچھ پڑھ سکتی تھی لیکن صنم کی بچی کی وجہ سے سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ تب ہی تو جیسے ہی صنم کمرے میں آئی اور بھیگے ہوئے کپڑے تبدیل کرنے کے لیے الماری سے دوسرے کپڑے نکالنے لگی، اس نے تیزی سے سر سے پیر تک چادر تانی اور سوتی بن گئی۔ اسے صنم کی آواز سن کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کتنے خوشگوار موڈ میں ہے اور اسے اپنے قصے سنا سنا کر کتنا بور کر سکتی ہے اس لیے بہتر یہی تھا کہ آلو کے پراٹھوں کو بھول کر بھوکی ہی سو جائے کیونکہ اس وقت وہ اپنے دل کو مزید جلانے کے موڈ میں قطعی نہیں تھی۔

***

اس روز وہ ذرا تاخیر سے گھر سے نکلا تھا۔ جس علاقے میں اس کی جگہ مخصوص تھی وہاں کاروبارِ زندگی کافی تاخیر سے شروع ہوتا تھا اور صبح کے ابتدائی حصے میں اسکول، کالج جانے والے طالب علموں اور دفاتر کے ملازمین ہی نظر آتے تھے۔ ہاں سورج جیسے، جیسے چڑھتا زندگی جاگنا شروع ہو جاتی اور دکانوں کے شٹر اٹھنے کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ پر مختلف اشیا فروخت کرنے والوں کی ریڑھیاں بھی سجنی شروع ہو جاتیں۔ وہ وہاں پہنچا تو چھولے والے حمید بھائی نے بھی ابھی کام کا آغاز ہی کیا تھا اور معمول کے مطابق گھڑے میں پانی بھرنے کے بعد تام چینی کی رکابیوں کو ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ ہاشو کو ان کے معمولات بہت اچھی طرح یاد تھے۔ رکابیوں کی ترتیب سے فارغ ہونے کے بعد وہ ٹماٹروں کے گول گول ٹکڑے اور پیاز کے لچھے کاٹتا تھا اور پھر انہیں اپنے چھولوں کے تھال پر بڑی ترتیب اور خوب صورتی سے سجا دیتا تھا۔ اس کے بعد اسے جھاڑن لے کر ایک آخری بار اپنے ٹھیلے پر سے دھول مٹی صاف کرنی ہوتی تھی پھر اس کے بعد قریبی اسکول میں آدھی چھٹی ہو جاتی تھی تو اسے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ ہاشو وہاں پہنچنے کے بعد اپنی مخصوص جگہ پر جا کر بیٹھنے کے بجائے سیدھا حمید بھائی کے پاس جا پہنچا۔

"اوئے ہاشو، کیا بات ہے آج بڑی دیر سے دھندے پر آیا؟" اسے اپنے قریب پا کر حمید بھائی نے دریافت کیا البتہ ان کی توجہ بدستور اپنے کام کی طرف ہی تھی۔

"یہ اپنے پاس رکھ لو حمید بھائی۔ میں شام کو واپس لے لوں گا۔" اس نے ان کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔

"کیا مطلب..... تو کہاں جا رہا ہے؟" اپنے ہاتھوں کو ذرا کی ذرا روک کر حمید بھائی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بس جا رہا ہوں ایک کام سے۔ تم کامیابی کی دعا کرنا۔" روزانہ حمید بھائی اس سے دعا کی درخواست کرتے تھے آج اس نے انہیں یہ ذمے داری سونپی۔

"پر بتا تو سہی کہ کدھر جا رہا ہے۔ تیرے پیچھے تیرے ٹھیے پر کسی نے قبضہ کر لیا تو تجھے بڑی پریشانی ہو گی۔" اگرچہ وہ پیشہ ور گداگروں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس کے مختلف اطوار کی وجہ سے حمید بھائی کبھی اس سے بری طرح پیش نہیں آتا تھا اور ویسے ہی اس کی فکر کرتا تھا جیسے حصولِ معاش کے لیے قریب، قریب ایک ہی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر اپنے، اپنے دھندے کرنے والے ایک دوسرے کی کرتے تھے۔

"ہونے دو قبضہ، مجھے پروا نہیں۔" اس نے بیزاری سے کہا اور کاسہ ٹھیلے پر رکھ کر مزید سوال جواب کا موقع دیے بغیر تیزی سے وہاں سے دور ہٹ گیا۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اسے کہاں سے آغاز کرنا تھا یہ وہ پہلے ہی طے کر چکا تھا چنانچہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کا رخ مسجد کے مقابل بنی ان دکانوں کی طرف تھا جن میں مختلف ورکشاپس قائم تھیں۔ فاصلہ بہت زیادہ نہ ہونے کے باوجود اسے امید تھی کہ ان ورکشاپس کے مالکان میں سے کوئی اسے پہچانتا نہیں ہو گا کیونکہ وہ جس علاقے میں بیٹھتا تھا وہ اس مسجد کی بیک سائڈ پر پڑتا تھا جہاں وہ نماز پڑھنے جاتا تھا اور اس طرف کے لوگ عموماً ایک دوسری مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تھے۔ اور اس نے جان بوجھ کر ایسی مسجد کا انتخاب کیا تھا جہاں اسے اپنے چہرہ شناسوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ویسے بھی وہ جتنی خاموشی سے وہاں بیٹھتا تھا بہت کم لوگ ہی اس کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور مشکل ہی تھا کہ ارد گرد کے پتھارے داروں اور مستقل وہاں سے گزرنے والوں کے علاوہ کوئی اور اسے پہچانتا ہو۔

"کیا بات ہے اوئے..... کیوں ٹکٹکی باندھے یہاں کھڑا ہے؟" وہ آیا تو بہت عزم سے تھا لیکن پہلی ورکشاپ کے سامنے پہنچ کر ہی جھجک نے اس کے قدم پکڑ لیے تھے اور سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس طرح اپنا مدعا بیان کرے۔ ورکشاپ کے مالک نے میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ایک اجنبی لڑکے کو سامنے کھڑا دیکھا تو خود ہی ڈپٹ کر پوچھنے لگا۔

"وہ جی... مجھے کام کی تلاش ہے۔ آپ کے ہاں مجھے کام مل جائے گا کیا؟" اس نے تھوک نگلتے ہوئے بڑی مشکل سے دریافت کیا۔

"کیا کام آتا ہے تجھے؟ گاڑی کا انجن بنانا جانتا ہے کیا؟" مالک نے اسے گھورتے ہوئے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

"کام تو نہیں آتا پر سیکھ لوں گا۔" اس کے سخت حوصلہ شکن رویے کے باوجود اس نے ہمت کر کے اپنے عزم کا اظہار کیا۔ رات بھر کی کشمکش کے بعد اس نے یہی طے کیا تھا کہ کسی طرح حلال روزی کمانے کی کوشش کرے گا اب اس کوشش میں کوئی مشکل آڑے آتی تو وہ تو اسے برداشت کرنی ہی تھی۔

"یہ لونڈے دیکھ رہا ہے میری ورکشاپ پر۔ ان کے دودھ کے دانت بھی نہیں جھڑے تھے تب سے یہ یہاں کام کر رہے ہیں۔ برسوں لگائے ہیں انہوں نے تب جا کر کام کی الف ب سمجھے ہیں۔ تیرا جیسا لم ڈھینگ کام سیکھنا شروع کرے گا تو بڑھاپے میں جا کر سیکھے گا۔ جا بھئی جا، میں تیرے جیسے بڈھے طوطوں کو نہیں سکھا سکتا۔" وہ کچھ زیادہ ہی سخت طبیعت کا مالک لگتا تھا۔ ہاشو کی ہمت ٹوٹنے لگی۔

"آپ مجھے ایک موقع تو دیں استاد۔ اگر شکایت کا موقع دوں تو پھر کہنا۔" وہ یہاں سے ہٹ کر اگلی ورکشاپ کی طرف جانے سے پہلے ہر ممکن کوشش کر لینا چاہتا تھا کیونکہ یہ تو طے تھا کہ کہیں بھی آسانی سے کام نہیں ملنے والا۔

"ابے تو ہے کون؟ صبح، صبح آ کر متھا کھانا شروع ہو گیا۔ میں ایسے ہی کسی کو اپنی ورکشاپ پر نہیں رکھ لیتا۔ کوئی گارنٹی لینے والا ہو تو پھر بات کرتا ہوں ورنہ تجھ جیسے لونڈوں کا کیا بھروسا ہے کہ چوری چکاری کر کے چلتے بنیں۔"

"میں اس کی گارنٹی لیتا ہوں رحیم داد۔ اسے کام پر رکھ لو کوئی شکایت ہو تو مجھ سے کہنا۔" ضمانت کی شرط بہت کڑی تھی۔ وہ کہاں سے ایسا معزز آدمی لاتا جو اس جیسے گداگر کی اولاد کی ضمانت دیتا چنانچہ سر جھکا کر وہاں سے پلٹنے ہی والا تھا کہ کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ورکشاپ کے مالک سے کہا۔ وہ اس آواز کو سن کر اچھل پڑا۔ نرم اور میٹھے لہجے میں بولنے والا وہ شخص صوفی صاحب کے سوا بھلا کون ہو سکتا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

''اَرے صوفی صاحب آپ! آئیں بیٹھیں ناں۔'' دُرشتی سے بولنے والے ورکشاپ کے مالک کا لہجہ یکسر بدل گیا اور اس نے فوراً ہی ایک کرسی کو جھاڑتے ہوئے انہیں بیٹھنے کی پیشکش کی۔

''معاف کیجیے گا صوفی صاحب! مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ لڑکا آپ کا جاننے والا ہے۔ اگر یہ پہلے ہی آپ کا حوالہ دے دیتا تو اتنی بحث کی نوبت ہی نہیں آتی۔'' انہیں عزت سے بٹھانے کے بعد اب وہ شرمندگی سے وضاحتیں پیش کر رہا تھا۔

''آدمی کو پہچاننا سیکھو رحیم داد۔ یہ اتنی روشن پیشانی والا لڑکا تمہیں کہیں چور اُچکا لگ رہا ہے کیا؟'' ان کا لہجہ حسبِ معمول نرم ہی تھا لیکن پھر بھی اس میں جھلکتی خفگی کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔ ان کی بات سن کر ہاشو کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔ گداگری کے داغ سے بدنما ہوئی اس کی پیشانی پتا نہیں کیسے صوفی صاحب کو روشن لگی تھی۔

''ہمارے پاس آپ کی سی نظر کہاں صوفی صاحب لیکن بس اب آپ نے کہہ دیا ہے تو انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دیکھیے گا کیسا فرسٹ کلاس مکینک بناتا ہوں اسے۔'' رحیم داد کے اس دعوے پر تقدیر کہیں دور کھڑی ہنس رہی تھی البتہ ہاشو خوش تھا کہ اس کی پہلی کوشش ہی کامیاب رہی۔ وہیں صوفی صاحب کے سامنے ہی اس کے کام کے اوقات، ہفتے کی ادائیگی اور ایک وقت کھانے کی فراہمی کے معاملے طے پا گئے۔ رحیم داد نے اس کے لیے جو ہفتہ وار رقم مقرر کی تھی وہ اس جیسے نکھے گداگر کی بھی دو دن کی آمدنی سے کم تھی لیکن پھر بھی وہ خوش تھا کہ اب اس کا شمار ان لوگوں میں نہیں ہوگا جو اپنے دامن میں چنگاریاں جمع کرتے، بے گوشت چہروں کے ساتھ روزِ حشر اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے۔ باعزت روزگار سے جُڑ جانے کی خوشی نے فی الحال تو اسے ان مسائل سے بھی بے فکر کر دیا تھا جن سے اسے آنے والے وقت میں نبرد آزما ہونا تھا۔

***

''یہ دیکھو کتنے خوب صورت ٹاپس دیے ہیں مجھے راحم نے۔'' صنم نے سرخ مخملی ڈبیا میں رکھے ٹاپس اس کے سامنے کیے۔ درمیان میں بڑے سے فیروزی نگ کے ساتھ چار اطراف ننھے ننھے سفید نگوں سے مزین وہ چوکور شکل کے ٹاپس واقعی بہت خوب صورت لگ رہے تھے اور مخملی ڈبیا میں رکھے جگمگا رہے تھے۔

''تم پھر راحم سے ملنے گئیں۔ میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ اس طرح کی حرکتیں نہ کرو۔ امی ابو کو معلوم ہو گیا تو وہ دونوں دُکھی ہوں گے کہ تم انہیں اس طرح دھوکا دے رہی ہو۔'' ٹاپس کی خوب صورتی سے متاثر ہونے کے بجائے اس نے سنجیدگی سے بہن کو ٹوکا۔

''دھوکے کی کیا بات ہے...... کوئی میں اپنی مرضی سے تو اس کے ساتھ چکر نہیں چلا رہی ہوں۔ امی ابو نے ہی اسے میرے لیے منتخب کیا ہے اور اگر میں اپنے منگیتر کی خواہش پر اس سے تھوڑی دیر فون پر بات کر لیتی ہوں یا کبھی کبھار ملنے چلی جاتی ہوں تو اس میں کیا برائی ہے۔'' حسبِ معمول اس کی نصیحت کو خاطر میں لائے بغیر صنم نے اپنے عمل کے حق میں دلیل دی۔

''حرج یہ ہے کہ منگنی کوئی ایسا پائیدار رشتہ نہیں ہے جس کی بنیاد پر یوں مرد و زن آزادانہ میل جول رکھنے لگیں۔ یہ تو بس دو فریقین کے درمیان ہونے والا ایک معاہدہ ہے جو شرعی اور قانونی مراحل طے ہونے تک ڈانواں ڈول ہی رہتا ہے۔ تم نے آئے دن لوگوں کی منگنیاں ٹوٹتی نہیں دیکھی ہیں کیا؟'' آج وہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ تھی اس لیے صنم کی خوب کلاس لے رہی تھی۔

''ٹوٹتی تو میں نے شادیاں بھی دیکھی ہیں تو کیا منگیتر کی طرح میاں بیوی کے رشتے پر بھی اعتبار کرنا چھوڑ دوں۔'' صنم کو اس کا سمجھانا برا لگا اور منہ بنا کر بولتے ہوئے ٹاپس کی ڈبیا ایک جھٹکے سے بند کی۔

''بے وقوفوں والی بات مت کرو۔ شادی ایک مختلف معاملہ ہے اور اگر خدانخواستہ کسی کی شادی ختم ہو بھی جاتی ہے تو وہ اپنے دل میں پشیمانی یا احساسِ جرم تو محسوس کرتا۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم اتنی نحوست بھری باتیں کیوں کر رہی ہو۔ میری راحم سے منگنی ہوئی ہے انشاء اللہ شادی بھی اسی سے ہوگی۔ ہم نے تو ابھی سے برائیڈل ڈریس کی سلیکشن کے ساتھ ساتھ ہنی مون کا پروگرام بھی بنانا شروع کر دیا ہے اور تم ہو کہ مجھے رشتوں کا فرق سمجھانے بیٹھی ہوئی ہو۔'' وہ سخت خفا تھی۔

''بہن کی حیثیت سے جو میرا فرض بنتا ہے''

کر رہی ہوں۔ یہ وقت راحم کے ساتھ فضول گپیں لگانے کا نہیں بلکہ امتحان کی تیاری کا ہے۔ دل لگا کر پڑھو تا کہ اچھے نمبروں سے پاس ہونے کی صورت میں سسرال والوں کی نظر میں کچھ عزت بنا سکو۔'' اس نے سمجھایا۔

''میرے نزدیک دوسروں کی نظروں میں عزت بننے سے زیادہ راحم کے ساتھ محبت بھرے لمحات گزارنا اہم ہے۔'' صنم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

''اُف پاگل لڑکی، میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں کہ یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ راحم کے ساتھ محبت بھرے لمحات بتانے کے لیے شادی کے بعد تمہیں بے شمار مواقع ملیں گے لیکن ابھی تمہارے پاس ایسا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ فی الحال تم دونوں ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہو۔'' وہ اپنی سی کوشش کر رہی تھی کہ بہن کو اپنی مذہبی اور معاشرتی اقدار کا احساس دلا سکے۔

''محرم اور نامحرم کی باتیں تو تم ایسے کر رہی ہو جیسے خود سات پردوں میں رہتی ہو؟'' صنم نے بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔

''ٹھیک ہے، میں سات پردوں میں نہیں رہتی لیکن کسی نامحرم کو اتنا موقع بھی تو نہیں دیتی کہ وہ کسی کمزور لمحے میں فائدہ اٹھا سکے۔ تم نے سنا نہیں ہے کہ تنہا مرد و زن کے بیچ تیسرا...... شیطان ہوتا ہے اور تم راحم سے چوری چھپے مل کر اس شیطان کو اپنا وار کرنے کا موقع دے رہی ہو۔'' صنم کی بدتمیزی کے باوجود اس نے اسے سمجھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔

''بند کرو یہ نامحرم، نامحرم کی رٹ...... میں جانتی ہوں کہ تم جیلسی میں ایسی باتیں کرتی ہو کیونکہ عاصم بھائی، راحم کی طرح تمہیں لفٹ جو نہیں کرواتے۔ انہیں نہ تو تم سے فون پر بات کرنے کی بے چینی ہوتی ہے اور نہ ہی ملنے کی فکر۔ انہوں نے کوئی قیمتی تحفہ تو چھوڑو کبھی تمہارے لیے کوئی معمولی سا گفٹ بھی نہیں بھجوایا۔'' وہ بدلحاظی پر اتر آئی تو اس کا چہرہ اتر گیا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس حد تک اپنے دل میں میرے لیے بدگمانی رکھتی ہو۔ بہن کی حیثیت سے میرا جو فرض بنتا تھا وہ میں نے ادا کر دیا لیکن اگر تم سمجھتی ہو کہ تم زیادہ سمجھ دار ہو تو میں تمہیں کچھ نہیں سمجھاؤں گی۔ رہی عاصم کی راحم جیسی حرکتیں نہ کرنے کی بات تو تھینک گاڈ کہ وہ ایسے نہیں ہیں ورنہ میرے لیے اس قسم کی چیپ حرکتیں برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا۔'' آخر کار اس کا ضبط بھی جواب دے گیا اور وہ اسے سختی سے چند باتیں سنانے کے بعد کتابیں لیے کمرے سے باہر نکل کر برآمدے میں تخت پر جا بیٹھی۔ باورچی خانے میں کام کرتی ماں نے اسے وہاں بیٹھا دیکھا تو دھیرے سے مسکرا دی۔ بچپن سے یہ معمول تھا کہ جب صنم ضرورت سے زیادہ باتیں کرتی تو ارم اس سے بچنے کے لیے کتابیں لے کر اپنے مشترکہ کمرے سے باہر آ جاتی، پڑھائی کے سلسلے میں اس کی انتہائی سنجیدگی صنم کے باتونی پن کو سہارنے کی متحمل ہی نہیں ہو پاتی تھی لیکن انہیں اندازہ نہیں تھا کہ آج معاملہ ذرا دیگر ہے اور ارم، صنم کے باتونی پن سے نہیں بلکہ آزادانہ روش سے گھبرائی ہوئی ہے۔

***

ہاشو نے ورکشاپ پر کام کرنا شروع کیا تو بہت پُرجوش تھا چنانچہ اور لڑکوں کے مقابلے میں بے حد جانفشانی سے کام کر رہا تھا حالانکہ خوراک کا معاملہ یہ تھا کہ پورے دن میں وہ صرف ایک وقت کا کھانا کھاتا اور یہ وہ کھانا تھا جو ورکشاپ کے مالک کی طرف سے وہاں کام کرنے والے لڑکوں کو فراہم کیا جاتا تھا۔ اس کھانے کو کھا کر اس نے زندگی میں پہلی بار خود کو معزز انسان محسوس کیا تھا کیونکہ زندگی میں پہلی بار وہ محنت کی کمائی کھا رہا تھا ورنہ اس سے قبل تو مانگے کے ٹکڑوں پر ہی پلتا رہا تھا چنانچہ وہ دو وقت کا فاقہ کرنے کے باوجود بھی خوش تھا۔ ورکشاپ کا مالک بھی اس کی کام میں دلچسپی اور لگن دیکھ کر خوش تھا۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے لڑکے موقع دیکھ کر سستانے لگ جاتے یا ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہو جاتے لیکن اس کا یہ حال تھا کہ کسی کام کو کہا جائے یا نہ کہا جائے سارا ٹائم الرٹ رہتا۔ اس کے لیے یہ ملازمت دوسرے لڑکوں سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ دوسرے لڑکوں کے لیے تو وہ صرف پیٹ پالنے کا ایک ذریعہ تھا جبکہ وہ اس ملازمت کے ذریعے زندگی کے ایک فیز سے دوسرے فیز میں داخل ہو سکتا تھا۔ اس کے پاس مہلت بھی بہت کم تھی کیونکہ اسے معلوم تھا وہ یہ بات زیادہ عرصے تک اپنے گھر والوں سے چھپانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا چنانچہ وہ کسی ہوکے میں مبتلا شخص کی طرح کام

سیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی لگن سے متاثر ہونے کے باوجود ورکشاپ کا مالک رحیم داد اس کی اتنی بے تابی دیکھ کر ایک دن کچھ چڑ گیا اور غصے سے بولا۔

"ذرا دھیرے چلو میاں، زیادہ تیز چلنے والے ٹھوکر کھا کر گر بھی جاتے ہیں۔"

"میں ذرا دیر سے اس دوڑ میں شامل ہوا ہوں ناں استاد۔ اس لیے مقابلہ برابر کرنے کے لیے مجھے دوسروں سے تیز دوڑنا پڑ رہا ہے۔" اپنی خداداد ذہانت سے کام لیتے ہوئے اس نے استاد کو ایسا جواب دیا کہ وہ غصہ بھول کر ہنس پڑا۔

"لڑکے تو بڑا تیز ہے۔ میری پہلے دن کہی بات کو تو نے یاد رکھا ہے۔ خیر جانے دے، میں یقین سے کہتا ہوں کہ اگر تو اسی طرح محنت اور لگن سے کام کرتا رہا تو ایک دن کام میں پرفیکٹ ہو جائے گا اور اسی لائن میں کہیں اپنی ورکشاپ کھول کر بیٹھا ہوگا۔" استاد کی اس پیش گوئی نے اس کا دل خوش کر دیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ دل لگا کر کام کرنے لگا۔ صبح سے لے کر شام تک جاری اس مشقت میں ایک چھوٹا سا وقفہ بس اس وقت آتا تھا جب لڑکے دوپہر کا کھانا کھا کر ظہر کی نماز کے لیے جاتے تھے اور کچھ دیر صوفی صاحب کے درس میں بیٹھتے تھے۔ ورکشاپ کا مالک رحیم داد صوفی صاحب کا بڑا عقیدت مند تھا چنانچہ کام کے معاملے میں کافی سخت ہونے کے باوجود لڑکوں کو درس میں بیٹھنے کی اجازت دے دیتا تھا۔ ہاشو اپنی زندگی کے اس رخ سے بہت خوش تھا لیکن اس کی یہ خوشی چند دن سے زیادہ قائم نہ رہ سکی۔ دھندے پر نہ بیٹھنے کے سبب اس کی رہی سہی آمدنی بھی ختم ہو گئی۔ شروع کے چند دن تو اس نے حمید بھائی کے پاس امانتاً رکھوائی گئی اس رقم سے کام چلایا جو صوفی صاحب نے اسے دی تھی لیکن وہ چھوٹی سی رقم کہاں تک ساتھ دیتی آخر بہت جلد وہ وقت آ گیا جب اسے خالی ہاتھ گھر جانا پڑا۔ اس کا باپ جامو پہلے ہی اس کی کم آمدنی پر ناخوش تھا۔ وہ خالی ہاتھ گھر پہنچنے لگا تو اس سے برداشت نہیں ہوا اور روز اسے چار چوٹ کی لگانے لگا۔ وہ اس مار کو بھی بڑی استقامت سے سہتا رہا لیکن اس سے بھی کام نہ چلا۔ اس کا باپ شاید اس کے روز روز خالی ہاتھ آنے کے علاوہ بدلی ہوئی روش سے بھی کھٹک گیا تھا چنانچہ حقیقت کا کھوج لگانے نکل کھڑا ہوا اور بہت جلد جان گیا کہ اس کا بیٹا اپنا گداگری کا آبائی پیشہ چھوڑ کر ایک ورکشاپ پر کام کر رہا ہے اس روز اس نے گھر پہنچتے ہی ہاشو کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"نہیں پھیلائے جاتے مجھ سے لوگوں کے سامنے ہاتھ۔ گھن آتی ہے مجھے خیرات میں ملی ہوئی روٹی کھانے سے...... اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں کام سیکھوں گا اور اپنی محنت کی کمائی کھاؤں گا۔" جب بات کھل گئی تو ہاشو بھی نڈر ہو گیا اور باپ کو صاف لفظوں میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس کی یہ جرأت اسے بہت مہنگی پڑی۔ پٹتا تو وہ اکثر ہی تھا لیکن اس روز اسے ایسی مار پڑی کہ اس کی روح تک بلبلا اٹھی۔ اگر اس کی ماں درمیان میں نہ آ جاتی تو شاید جامو اسے جان سے ہی مار دیتا۔ کسر اب بھی اس نے کوئی نہ چھوڑی تھی۔ زخموں سے چور ہاشو اس رات تکلیف کے باعث ایک پل کے لیے بھی نہیں سو سکا۔ باپ اور بھائی کے گھر سے نکل جانے کے بعد ماں نے اس کے زخموں پر مرہم لگایا اور پاس بیٹھی بہت دیر تک سمجھاتی رہی کہ وہ اپنے آبائی پیشے کو چھوڑنے کا خیال دل سے نکال دے ورنہ بہت برے انجام سے دوچار ہوگا۔ اس نے ہاشو کو سمجھایا کہ یہ مار جو اسے اپنے باپ سے پڑی ہے کچھ بھی نہیں ہے اگر قبیلے کے سردار کو اس کی حرکتوں کا علم ہو گیا تو وہ اس سے کئی گنا زیادہ سخت سزا دے گا۔ ہاشو ماں کی ساری نصیحتوں اور ڈراووں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالتا رہا البتہ دل میں یہ عزم پکا تھا کہ جیسے ہی ذرا حالت سنبھلی اپنے کام پر واپس لوٹ جائے گا لیکن جب دو دن بعد اس کے باپ نے اسے اس کے ٹھیے پر واپس پہنچایا تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اس نے اس کے لیے کھلنے والا نجات کا در بند کر دیا ہے۔ باپ کے جانے کے بعد اس نے حسبِ معمول کاسہ حمید بھائی کے ٹھیلے پر رکھا اور خود ورکشاپ پہنچ گیا۔ اسے ورکشاپ پر دیکھ کر رحیم داد کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

"تو ادھر کیوں آیا ہے؟" وہ حیرت سے سنبھلا تو غرایا۔

"معاف کر دو استاد! طبیعت بہت خراب تھی اس لیے دو دن کی چھٹی کرنی پڑی پر میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" اس نے بڑی لجاجت سے کہتے ہوئے کان پکڑے۔

"نہ بھائی نہ، دیکھ میں کان پکڑتا ہوں اور تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں کہ میری ورکشاپ کو چھوڑ کر کہیں اور کی راہ دیکھ۔ میرے میں اتنا دم نہیں ہے کہ تیری برادری والوں سے لڑتا پھروں۔" رحیم داد نے سچ مچ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تو اس کا ماتھا ٹھنکا اور احساس ہوا کہ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے پھر بھی ہمت کر کے رکتے ہوئے گلے کے ساتھ پوچھنے لگا۔

"کیا بات ہے استاد! تم ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو۔ کوئی مسئلہ ہے کیا؟"

"مسئلہ پوچھتا ہے سالے، یہ میری ورکشاپ دیکھ رہا ہے۔ تیرے باپ نے اپنی برادری کے ساتھ مل کر یہاں ایسی توڑ پھوڑ مچائی تھی کہ دو دن تک میں اور یہ لڑکے صرف اسی کی مرمت کرتے رہے۔" وہ زور زور سے بول رہا تھا اور اس کے پیچھے ورکشاپ پر کام کرنے والے لڑکے دم سادھے کھڑے تھے۔

"تیرا باپ صاف کہہ گیا ہے کہ اگر اب تو میری ورکشاپ پر نظر آیا تو وہ اس ورکشاپ کو آگ لگا دے گا۔ اب تو ہی بتا کہ میں اتنا بڑا خطرہ کیسے مول لے سکتا ہوں۔ یہ ورکشاپ ختم ہو گئی تو میرے بیوی بچے تو سڑکوں پر رُلتے پھریں گے۔ میں غریب آدمی ہوں بار بار کا نقصان نہیں اٹھا سکتا اس لیے تو مجھے معاف کر اور کہیں اور کی راہ لے۔" رحیم داد نے ایک بار پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے تو وہ شرمندہ ہو گیا۔

"مجھے معاف کر دینا استاد میری وجہ سے تمہارا بڑا نقصان ہو گیا۔" شرمندگی کے مارے وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا اور بوجھل قدموں سے واپس پلٹ گیا۔ واپس اپنی جگہ پر پہنچ کر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ ان حالات میں اب کیا قدم اٹھائے۔

"اوئے ہاشو! کیا ہوا۔ ایسے گھٹنوں میں سر دے کر کیوں بیٹھا ہے؟" حمید بھائی نے اسے واپس آ کر اس طرح بیٹھے دیکھا تو دور سے آواز دے کر پوچھا۔ وہ جواب میں کچھ نہیں کہہ سکا اور حسرت سے حمید بھائی کو دیکھنے لگا جو صبح سے شام تک سخت محنت کر کے اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے حلال روزی کماتے تھے۔

"کیا ہو گیا ہے یار ایسے رو کیوں رہا ہے؟" اسے معلوم بھی نہیں چلا کہ کب اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ہیں۔ حمید بھائی آنسو دیکھ کر قریب چلے آئے اور ہمدردی سے پوچھنے لگے۔ اس کے دُکھے ہوئے دل کو تو کسی غمگسار کی ہی تلاش تھی چنانچہ الف سے یے تک انہیں اپنی ساری داستان سنا ڈالی۔ اس کی کہانی سن کر وہ سوچ میں پڑ گئے پھر تھوڑی دیر بعد سر اٹھا کر بولے۔

"یہ تو بڑا ٹیڑھا مسئلہ ہے یار! تیری برادری والے تو تجھے کہیں بھی جم کر کام نہیں کرنے دیں گے اور ان کے ڈر سے کوئی تجھے کام دے گا بھی نہیں۔ پرسوں انہوں نے ورکشاپ پر جو توڑ پھوڑ کی تھی اس کی خبر یہاں تک بھی پہنچی تھی لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ سارا پھڈا تیری وجہ سے ہوا ہے۔"

"میں اس طرح بھیک مانگ کر زندگی نہیں گزار سکتا حمید بھائی...... اگر ان لوگوں نے مجھے مجبور کیا تو میں خودکشی کر لوں گا لیکن یہ ذلت بھرا کام نہیں کروں گا۔" اس نے بلکتے ہوئے حمید بھائی کے سامنے اپنے عزائم کا اظہار کیا جنہیں سن کر وہ بوکھلا گئے۔

"ابے پاگل ہوا ہے کیا جو ایسی باتیں کر رہا ہے۔ حلال حرام روزی کا فرق جانتا ہے تو پھر یہ نہیں جانتا کہ خودکشی کی موت حرام موت ہوتی ہے اور ایسے آدمی کا تو جنازہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ حرام موت مرنے والے کی تو اللہ کے ہاں بھی بخشش نہیں ہوتی۔ ایسا تو، تو ہرگز سوچنا بھی نہیں ورنہ یہ دنیا تو تیری برباد ہے ہی وہ دنیا بھی برباد ہو جائے گی۔" حمید بھائی کی معلومات کا ذریعہ پتا نہیں کیا تھا اور وہ جو کچھ اسے سمجھا رہے تھے اس میں حقیقت بھی تھی یا نہیں لیکن بہرحال اتنا ضرور ہوا کہ وہ سہم گیا اور خودکشی کے ارادے کو فی الفور اپنے ذہن سے نکال دیا۔

"ٹھیک ہے نہیں کرتا خودکشی...... مگر آپ ہی بتاؤ کہ پھر کیا کروں؟ بھیک تو بہرحال اب مجھ سے نہیں مانگی جائے گی۔ میں نے عزت کی روٹی کا ذائقہ چکھ لیا ہے اب ذلت کی نہیں کھا سکتا۔" وہ بڑا بے بس اور اداس نظر آ رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر حمید بھائی کو اس پر رحم آ گیا اور سوچتے ہوئے بولے۔

"میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آ رہا ہے۔ میں تیری اتنی مدد کر سکتا ہوں کہ تجھے پھولوں کا ایک تھال تیار کر کے لا دیا کروں۔ تو وہ تھال اپنے سر پر رکھ کر گلی گلی بیچتے پھرنا۔ اس طرح تجھے روز کے روز کمائی ہو گی تو خالی

ہاتھ گھر واپس نہیں جایا کرے گا دوسرے تیری مدد کرنے کے جرم میں کسی دوسرے پر بھی مصیبت نہیں آئے گی۔ پکڑے جانے کی صورت میں تو کسی کے سامنے میرا نام تو نہیں لے گا ناں؟" اسے اپنا منصوبہ بتاتے ہوئے انہوں نے آخر میں تشویش سے پوچھا۔

"نہیں حمید بھائی، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چاہے میرا باپ میری جان ہی کیوں نہ نکال دے لیکن میں تمہارا نام کسی صورت زبان پر نہیں لاؤں گا۔" اسے اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی تو ایک بار پھر پُرعزم ہو گیا اور جھٹ حمید بھائی سے وعدہ کر لیا۔ اگلے دن پھر اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ حمید بھائی نے حسبِ وعدہ اسے تیار کالے چھولوں کا ایک تھال مہیا کر دیا جسے سر پر اٹھائے وہ گلی گلی آوازیں لگا کر چھولے بیچنے لگا۔ ایک تو حمید بھائی کے ہاتھوں کے تیار کردہ چھولے ہوتے ہی بہت ذائقہ دار تھے دوسرے کچھ دخل اس کے اپنے جذبے کا بھی تھا کہ اللہ نے اس کے کام میں برکت ڈالی اور اس کے چھولے ہاتھوں ہاتھ بکنے لگے۔ آمدنی مناسب تھی اس لیے وہ باقاعدگی سے گھر واپسی پر اپنے باپ کو رقم فراہم کرنے لگا۔ سخت دھوپ میں گلی گلی پھرنے کی مشقت اچھی خاصی تھی۔ دن بھر وہ اتنا چلتا تھا کہ پاؤں اکڑ کر رہ جاتے تھے پھر بھی اسے اطمینان تھا کہ اپنی محنت کی حلال روزی کھا رہا ہے۔ دل میں کوئی قلق تھا تو بس یہ کہ رحیم داد کی ورکشاپ کے ساتھ ساتھ صوفی صاحب کی پُرنور صحبت بھی چھوٹ گئی۔ جب سے ورکشاپ پر کی گئی اپنے باپ کی کارگزاری اس کے علم میں آئی تھی وہ شرمندگی کے مارے اس مسجد کا رخ نہیں کر سکا تھا جہاں صوفی صاحب ہوتے تھے۔ اس میں ان کا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہیں تھی کیونکہ ایک طرف تو یہ شرمندگی تھی کہ وہ اس کی حقیقت سے واقف ہو گئے ہیں۔ دوسرے وہ اس لیے بھی نادم تھا کہ صوفی صاحب نے اس کے بارے میں کچھ نہ جاننے کے باوجود رحیم داد کو اس کی ضمانت دی تھی۔ اپنی اس ضمانت پر یقیناً بعد میں انہیں اس کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑی ہوگی۔ وہ اس بات کے لیے خود کو صوفی صاحب کا مجرم سمجھتا تھا اور اپنے اندر معافی طلب کرنے کے لیے بھی ان کے سامنے جانے کی ہمت نہیں پاتا تھا لیکن آخر کار اسے ان کا سامنا کرنا ہی پڑا۔

اس روز بھی وہ معمول کے مطابق گلی گلی آواز لگاتے ہوئے اپنے چھولے بیچ رہا تھا کہ ایک گلی کے وسط میں اس کے قدم تھم کر رہ گئے۔ یقینی طور پر وہ صوفی صاحب تھے جو اس گلی کے ایک گھر سے باہر نکل رہے تھے۔ انہوں نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اس لیے بھاگ نکلنا بھی ممکن نہیں تھا بس وہ جم کر اپنی جگہ کھڑا رہا۔ صوفی صاحب خود قدم بہ قدم چلتے ہوئے اس کے قریب پہنچے اور معمول کے مطابق نرم لہجے میں بولے۔

"کیا حال ہے تمہارا ہاشو! بہت دن ہوئے تم مسجد نہیں آئے۔ کیا نماز پڑھنا چھوڑ دی؟"

"نن... نہیں صوفی صاحب، نماز تو پڑھتا ہوں لیکن دوسری مسجد میں۔" اس نے ہکلاتے ہوئے انہیں جواب دیا۔

"چلو ٹھیک ہے، آدمی کو نماز پڑھنی چاہیے۔ مسجد کوئی بھی ہو اس سے فرق نہیں پڑتا پر کبھی کبھار ہماری محفل میں آ جایا کرو۔ تم نہیں ہوتے تو تمہاری کمی سی محسوس ہوتی ہے۔" انہوں نے کمالِ محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"مجھے معاف کر دیں صوفی صاحب، میری وجہ سے آپ کو شرمندگی اٹھانی پڑی ہوگی۔ آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ کس بدبخت کی سفارش کر دی۔ آپ کو کہاں معلوم ہو گا کہ جس کی اتنی طرف داری کر رہے ہیں وہ کیسا نیچ ہے۔" وہ تو پہلے ہی دل میں ان سے شرمندہ تھا اب موقع ملا تو رو رو کر معافی مانگنے لگا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے بیٹا، بے شک پہلے میں تمہارے پس منظر سے واقف نہیں تھا لیکن جاننے کے بعد بھی میری رائے آج بھی تمہارے بارے میں وہی ہے جو پہلے دن تھی اور دیکھو میں اپنی رائے میں کتنا درست ہوں۔ اگر درست نہ ہوتا تو آج تم مجھے سر پر چھولوں کا تھال اٹھا کر پھرنے کے بجائے کہیں ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگتے نظر آتے۔" انہوں نے یک دم ہی اسے ہر بوجھ سے آزاد کر دیا۔

"شکریہ صوفی صاحب! آپ بس میرے لیے دعا کیجیے گا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہوں۔" اس نے ان سے گزارش کی۔

"ہمت اور لگن سے کام لیتے ہوئے ثابت قدم رہے تو کیوں کامیاب نہیں ہو گے۔ بس یہ یاد رکھنا کہ

تمہارا راستہ بہت دشوار ہے اس لیے تمہیں جدوجہد بھی بہت زیادہ کرنی ہوگی۔ آگے اللہ مالک ہے۔" انہوں نے اپنے مخصوص ٹھنڈے میٹھے لہجے میں کہا اور پھر جس گھر کے دروازے سے باہر نکلے تھے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "وہ میرا گھر ہے، وہاں میں اپنے دو بیٹوں اور ان کی آل اولاد کے ساتھ رہتا ہوں۔ کئی برس ہوئے سیکنڈری اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی پوسٹ سے ریٹائر ہو کر اب زیادہ وقت مطالعے اور مسجد میں گزرتا ہے یا پھر پوتا پوتی کے ساتھ کچھ دیر کھیل اور گپ شپ میں دل بہلاتا ہوں۔ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ بڑا عام سا اور کچھ بیکار آدمی ہوں لیکن اگر کبھی تمہیں کسی مدد کی ضرورت پڑے یا ملنے کا دل چاہے تو میرے پاس چلے آنا۔ مجھ سے اپنی استطاعت کے مطابق تمہارے لیے جو ہو سکا ضرور کروں گا۔" وہ اس کا شانہ تھپتھپا کر آگے بڑھ گئے تو وہ بھی چل پڑا لیکن چند روز بعد ہی صوفی صاحب کی یہ بات صحیح ثابت ہو گئی کہ تمہارا راستہ بہت دشوار ہے۔ وہ ایک بار پھر پکڑا گیا اور اس بار اس کی چوری پکڑنے والا اس کا باپ نہیں بلکہ برادری کا ایک ایسا شخص تھا جسے اس کے باپ سے ہمیشہ عداوت رہتی تھی۔ اس نے اسے گلی گلی پھر کر چھولے بیچتے دیکھا تو سیدھا برادری کے سردار کو خبر دے دی۔ سردار کو اس کی پہلی لغزش کے بارے میں بھی علم تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس لڑکے کے سر میں محنت کی کمائی حاصل کرنے کا سودا سمایا ہوا ہے لیکن جامو نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ خود ہی اپنے بیٹے کے سر سے یہ بھوت اتارے گا اس لیے وہ بھی خاموشی اختیار کر گیا تھا لیکن نئی رپورٹ ملنے پر اسے سمجھ آیا کہ لڑکے کا بھوت اترا نہیں بلکہ پوری طرح موجود ہے۔ اس نے اسی رات باپ بیٹے دونوں کو اپنے ڈیرے پر بلوا بھیجا اور فردِ جرم سنائی جسے سن کر جہاں ہاشو کا دل سہما وہیں اس کا باپ جامو بھی ٹھٹک گیا۔ اپنے طور پر تو اس نے یہی گمان کیا تھا کہ ایک بار کی مار ہاشو کے لیے کافی رہی ہوگی اور آئندہ وہ ایسی غلطی نہیں کرے گا لیکن سردار کے ڈیرے پر پہنچ کر اسے سمجھ آیا کہ صورتِ حال بہت زیادہ نازک اور گمبھیر ہے۔ اس نے اسی وقت پاؤں سے جوتی اتاری اور بیٹے کے سر پر برسانے لگا۔

"بس کر دے جامو، ختم کر یہ ڈراما، یہ چھوکرا تیرے قابو میں آنے والا نہیں ہے۔ اس کا علاج مجھے ہی کرنا ہوگا۔" سردار کی کرخت آواز نے اس کے ہاتھ روک دیے لیکن دل بری طرح کانپنے لگا پھر بھی وہ ہمت کر کے لرزتی آواز میں بولا۔

"اس بار معاف کر دو سردار اور مجھے ایک موقع اور دو۔ میں اسے بالکل سیدھا کر دوں گا۔"

"نہ، نہ جامو۔ ایک موقع تجھے پہلے مل چکا ہے، اب دوبارہ نہیں مل سکتا۔ تجھے موقع دینے میں چھوکرا ہاتھ سے نکل گیا تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ برادری کے دوسرے بچے بھی اس کی طرح اونچے اونچے خواب دیکھنے لگیں گے اس لیے بہت ضروری ہے کہ اس کو ایسی سزا دی جائے جو باقیوں کے لیے سبق ہو۔" جامو کی کیفیت سے بے نیاز سردار اپنا فیصلہ سنا رہا تھا۔

"معافی دے دو سردار بچہ ہے، میں سمجھاؤں گا تو سمجھ جائے گا۔" جامو، سردار کے قدموں میں گر گیا۔ باپ کی یہ حالت دیکھ کر ہاشو کو جہاں یہ احساس ہوا کہ اس کے ساتھ کچھ بہت ہی برا ہونے والا ہے وہیں پہلی بار یہ بھی ادراک ہوا کہ اسے موقع بے موقع روئی کی طرح دھنک کر رکھ دینے والا اس کا باپ اس سے بہت محبت کرتا تھا تب ہی تو اس کی خاطر یوں سردار کے قدموں میں گرا پڑا تھا۔

"بچہ نہ بن جامو...... تو چنگی طرح جانتا ہے کہ جب ایک بار کوئی فیصلہ ہو جائے تو اسے بدلا نہیں جاتا۔ ہاں اگر تجھ میں بغاوت کی ہمت ہے تو بول...... میں تیرے چھوکرے کے ساتھ تیرا فیصلہ بھی ابھی کر دیتا ہوں۔" سردار کے لہجے میں سختی کے ساتھ سفاکی بھی در آئی تھی۔ اس کے بعد جامو اسے کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکا اور بس ایک کونے میں بیٹھا آنسو بہاتا رہا۔ ہاشو کو آنسو بہاتے بے بس باپ کے سامنے وہاں سے لے جایا گیا کیوں اور کس لیے یہ اسے اس وقت سمجھ آیا جب وہ اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہو چکا تھا اور چند دن بعد ہی پوری طرح زخم مندمل ہونے سے قبل، پہلے والے ٹھکانے سے بہت دور شہر کے ایک مصروف چوراہے پر پہنچا کر ڈھیر کر دیا گیا تھا۔ اب اسے کسی سے سوال کرنے کی واقعی حاجت نہیں رہی تھی۔ راہ چلتے لوگ اس کی حالتِ زار دیکھ کر خود ہی رحم کھاتے ہوئے اس کے سامنے سکے پھینک جاتے تھے جو شام ہونے تک

ایک ڈھیر کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ اب سردار اور باپ میں سے کسی کو اس سے یہ شکوہ نہیں رہا تھا کہ وہ ڈھنگ سے دھندا نہیں کرتا اس لیے اس کی آمدنی کم ہے۔ اب اس کی آمدنی اپنے خاندان کے باقی تینوں افراد سے کہیں زیادہ تھی لیکن آنکھوں کی جوت بجھ گئی تھی اور وہ کسی نیم مردہ شخص کی طرح مایوس اور دلگرفتہ بس زندگی کے دن پورے کر رہا تھا جو معلوم نہیں کتنے دنوں، ہفتوں، مہینوں یا برسوں پر محیط تھے۔

***

افضل علی کے چھوٹے سے گھر میں اس وقت خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ اس رونق کا سبب ارم اور صنم کے سسرالی رشتے دار تھے جو شادی کی تاریخ طے کرنے ان کے گھر پہنچے ہوئے تھے۔ ان رشتے داروں میں ان کے ساس سسر کے علاوہ لڑکوں کے ننھیالی اور ددھیالی رشتے دار بھی شامل تھے، اس لیے چھوٹا سا گھر خوب بھرا ہوا لگ رہا تھا۔ حشمت صاحب نے پہلے ہی ان دونوں میاں بیوی کو بتا دیا تھا کہ شادی کی تاریخ طے کرنے وہ اکیلے نہیں آئیں گے بلکہ ان کے ساتھ اُن کے چند قریبی رشتے دار بھی موجود ہوں گے۔ بقول ان کے اگر اس موقع پر ہم نے اپنے ان رشتے داروں کو نہ بلایا تو وہ اسے اپنی توہین سمجھیں گے اور شادی میں شرکت کے لیے راضی نہیں ہوں گے۔ افضل علی نے ان کی بات سن کر انہیں اپنی مرضی کے مطابق مہمان لانے کی اجازت دے دی تھی اور اب ان کے گھر میں لگ بھگ اتنے ہی مہمان موجود تھے جتنے منگنی کے موقع پر آئے تھے۔ افضل علی نے مہمانوں کی تعداد کے بارے میں پہلے ہی معلوم کر لیا تھا اس لیے اسی حساب سے انتظامات بھی کر لیے گئے تھے اور اب دونوں میاں بیوی نہایت خوش دلی سے مہمانوں کے ساتھ مصروف تھے۔

''آئیے ناں جمیلہ بہن! آپ تو اتنی مصروف ہیں کہ ہمارے پاس بیٹھ بھی نہیں رہیں۔'' جمیلہ کچن سے نکل کر سب کے درمیان آئیں تو حشمت صاحب کی بیگم نے محبت سے شکوہ کرتے ہوئے ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھایا۔

''برا مت مانیے گا بھابی، آپ تو سمجھ ہی سکتی ہیں کہ میں اکیلی سب کچھ دیکھنے والی ہوں۔ ویسے تو بچیاں میرا بہت ہاتھ بٹاتی ہیں لیکن اس وقت ظاہر ہے وہ کچھ نہیں کر سکتیں، اس لیے میں ذرا زیادہ مصروف ہو گئی ہوں۔'' جمیلہ نے بہت سبھاؤ سے اپنی مجبوری بیان کی۔

''آپ پریشان مت ہوں۔ میں سب سمجھتی ہوں بس ویسے ہی شکوہ کر دیا تھا۔'' انہوں نے فوراً جمیلہ کو تسلی دی۔

''ایسے موقع پر خاندان والے بہت کام آتے ہیں۔ آپ کو چاہیے تھا کہ اپنے خاندان کے چند لوگوں کو بھی دعوت دے دیتیں۔ سچ پوچھیں بھئی تو ہمارے ہاں اس بات کو بہت اہمیت دی جاتی ہے کہ بچوں کے شادی بیاہ کے معاملات خاندان برادری کے بیچ میں طے پائیں تاکہ بعد میں کچھ اونچ نیچ ہو جائے تو خاندان والے مدد کریں۔'' ارحم اور عاصم کی پھپھو جو ذرا تیز مزاج کی لگتی تھیں فوراً ہی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے بولیں۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن میں اور میرے شوہر اس معاملے میں بہت بدقسمت ہیں۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ والد صاحب کا میرے لڑکپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ اکیلی والدہ نے ہی محنت مزدوری کر کے ہمارا گھر چلایا اور جیسا کہ دستور ہوتا ہے کہ لوگ اپنے غریب رشتے داروں سے ملنا چھوڑ دیتے ہیں کہ کہیں ان کی کوئی مدد نہ کرنی پڑ جائے، ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ شادی کے بعد میری والدہ مرتے دم تک ہمارے ساتھ ہی رہیں لیکن وہ رشتے داروں کے رویے سے اتنی دلبرداشتہ تھیں کہ انہوں نے خود بھی کسی سے تعلق رکھنا پسند نہیں کیا۔ اتفاق سے ارم اور صنم کے والد بھی میری طرح دنیا میں تنہا تھے۔ سقوطِ ڈھاکا سے پہلے وہ اپنے خاندان کے ساتھ مشرقی پاکستان میں رہتے تھے۔ حالات بگڑے تو ان کا خاندان بھی مکتی باہنی کے حملے کی زد میں آ گیا۔ میرے شوہر اپنی جان بچا کر بھاگے اور بڑی مشکلوں سے مغربی پاکستان پہنچ گئے۔ یہاں ہی وہ زمانے کی ٹھوکریں کھا کر جوان ہوئے اور پھر ہماری شادی ہو گئی۔ آج ہم اپنی بچیوں کے ساتھ خوش باش ہیں اور پچھلے سارے غموں کو بھلا دیا ہے۔ اب بس دل میں اتنی خواہش ہے کہ بچیاں اپنے گھر میں خوش باش آباد ہوں اور ہمیں نواسوں، نواسیوں کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔ ہمارا خاندان تو بس اپنی بچیوں کے دم سے ہی آگے بڑھنا ہے۔'' جمیلہ کو اچھی طرح یاد تھا کہ منگنی کے موقع پر بھی ان سے چند خواتین نے اس طرح کے سوال جواب کیے تھے

اور انہوں نے انہیں ہر بات بتا دی تھی لیکن آج دوبارہ ذکر چھڑنے پر بھی انہوں نے ماتھے پر شکن لائے بغیر ایک بار پھر سارا قصہ دہرا دیا۔

''یہ تو ہے، بیٹیوں کے ساتھ آپ کا کم از کم ایک بیٹا بھی ہوتا تو اس سے نسل چلتی رہتی۔ اب تو آپ کو بیٹیوں سے ہی دل بہلانا ہے لیکن سچ پوچھیں تو جو بات پوتا پوتی کی ہوتی ہے وہ نواسا نواسی کی نہیں ہوتی۔ نواسا نواسی کو کتنا ہی چاہو کہلاتے پرایا ہی خون ہیں۔'' ان کے بے رحمی سے کہنے پر جمیلہ کے چہرے پر تاریک سایہ سا دوڑ گیا۔ ارم اور صنم کی پیدائش کے وقت وہ کچھ ایسی پیچیدگیوں کا شکار ہو گئی تھیں کہ مزید بچوں کا امکان ختم ہو گیا تھا۔ خود ان کی جان بھی مشکل سے بچی تھی لیکن اس وقت افضل علی نے بڑا دلاسا دیا تھا کہ ان کے لیے بس یہ دو بیٹیاں بھی کافی ہیں لیکن ظاہر ہے دنیا کی زبانیں تو بند نہیں کی جا سکتی تھیں۔ بولنے والے یہ سوچے بغیر کہ کسی کا دل کتنا دُکھے گا اپنا کہہ ڈالتے تھے۔

''چھوڑیں بھی آپا، یہ ساری بعد کی باتیں ہیں ابھی تو شادی کے معاملات طے کرنے ہیں پہلے وہ تو طے ہو جائیں کیوں جمیلہ بہن؟ آپ کے نزدیک کون سی تاریخ مناسب رہے گی؟'' مسز حشمت نے اپنی نند کی دل آزار باتیں سن کر نرمی سے انہیں ٹوک کر موضوعِ گفتگو بدل دیا۔ اُدھر ارم اور صنم اپنے کمرے میں بیٹھی اپنے مستقبل کا فیصلہ سننے کی منتظر تھیں۔

''اللہ کرے ذرا جلدی کی تاریخ طے ہو جائے۔'' ذرا سی کھڑکی کھول کر بننے والی جھری سے کمرے سے باہر جھانکتے ہوئے صنم نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''نہ بابا، میں تو چاہتی ہوں کہ پہلے میرا ایڈمیشن ہو جائے اس کے بعد ہی کی تاریخ رکھی جائے۔'' ارم نے فوراً اس کی مخالفت کی۔ ان کا ایف ایس سی کا رزلٹ آ چکا تھا۔ کامیاب دونوں ہی ہو گئی تھیں لیکن صنم واجبی نمبروں سے اور وہ نمایاں نمبروں کے ساتھ۔ اپنے نمبروں کو دیکھتے ہوئے اسے میڈیکل میں داخلہ مل جانے کی قوی امید تھی اسی لیے زیادہ دلچسپی بھی اسی میں تھی۔

''ہاں تمہیں ڈر ہو گا ناں کہ عاصم بھائی کہیں بعد میں انکار نہ کر دیں اس لیے پہلے سے معاملہ پکا کر کے جانا چاہتی ہو۔'' صنم نے چبھتے ہوئے لہجے میں اس پر طنز کیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ عاصم کس مزاج کے آدمی ہیں۔ ابھی تو انکل اور آنٹی نے حامی بھر لی ہے کہ انہیں میرے مزید پڑھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا لیکن پھر بھی میں گھبرا رہی ہوں کہ کہیں کسی وجہ سے میری اتنی محنت ضائع نہ ہو جائے۔'' اس نے برا مانے بغیر بہن کی تائید کی۔

''اسی لیے تو کہتی تھی کہ عاصم بھائی سے اور کچھ نہیں تو کم از کم ٹیلی فونک رابطہ رکھو۔ آپس میں بات چیت کرنے سے انڈر اسٹینڈنگ بڑھتی ہے اور لڑکی اس پوزیشن میں ہوتی ہے کہ اپنی بات منوا سکے۔ اب مجھے دیکھو، میں نے راحم کو تیار کر لیا ہے کہ بری کے کپڑے اور زیورات میری پسند سے تیار ہوں گے۔ بھئی جب پہننا مجھے ہے تو پسند بھی تو میری ہونی چاہیے۔'' وہ کھڑکی سے ہٹ کر اس کے قریب آ بیٹھی اور ایک ادا سے بال جھٹکتی ہوئی بولی۔

''مجھے ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ بری تیار کرنا لڑکے کے گھر والوں کا حق ہوتا ہے۔ ماں، بہنیں اتنے ارمانوں سے اس موقع کا انتظار کرتی ہیں کم از کم انہیں اپنے ارمان نکالنے کا موقع تو ملنا چاہیے۔ باقی ساری زندگی تو ویسے بھی اپنی مرضی سے ہی پہننا اوڑھنا ہوتا ہے پھر جہیز میں بھی لڑکیاں اپنی مرضی کے کپڑے ہی لے کر جاتی ہیں تو بری کے چند جوڑوں پر کمپرومائز کرنے میں کیا حرج ہے۔'' اس نے بہن کو سمجھانا چاہا۔

''میں تمہاری اس پچھلی صدی کی سوچ کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ میں تو وہی کروں گی جو مجھے صحیح لگے گا۔'' حسبِ معمول وہ قائل نہیں ہوئی۔ ارم نے بھی زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی وقت جمیلہ کمرے میں داخل ہوئی۔

''مبارک ہو بیٹا، تین ماہ بعد کی تاریخ طے ہوئی ہے۔ ارادہ تو اگلے ماہ کا تھا لیکن تمہاری ہونے والی پھپھی ساس کہنے لگیں کہ اس عرصے میں ان کی سسرال میں بھی دو تین شادیاں ہیں اس لیے یہ شادی ذرا آگے بڑھا کر رکھ لی جائے۔ لڑکوں کی اکلوتی پھپھی ہیں اس لیے ان کی بات ماننی ہی تھی۔ اچھا ہے اس طرح ہمیں بھی تیاری کے لیے زیادہ وقت مل جائے گا۔'' انہوں نے جلدی جلدی بیٹیوں کو تفصیلات سے آگاہ کیا پھر مزید بولیں۔ ''تم لوگ

ذرا ڈھنگ سے بیٹھ جاؤ، لڑکے والوں کی طرف کی خواتین تم دونوں کا منہ میٹھا کروانے یہاں آئیں گی۔'' اطلاع دینے کے بعد وہ فوراً ہی باہر نکل گئیں یہ تک نہیں دیکھا کہ ایک بیٹی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو دوسری کے چہرے پر غصے کی سرخی پھیلی ہوئی ہے۔

''لو مرو، ہوگئی تمہاری تمنا پوری۔ اب اتنے دن انتظار کرنا پڑے گا۔ تمہیں کیا معلوم کہ راحم کتنا بے چین ہے مجھے اپنے گھر میں دیکھنے کے لیے۔'' کچھ بس نہ چلا تو اس نے ارم پر ہی غصہ نکالا۔

''کرنے دو اسے انتظار، جتنا انتظار کرے گا تمہاری اتنی ہی قدر ہوگی۔'' ارم نے اسے چھیڑا۔

''مجھ سے بات مت کرو۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہی ہوا ہے اور ان پھپھی صاحبہ کو تو میں شادی کے بعد دیکھ لوں گی۔ مجھے سب معلوم ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا ہے۔ وہ تو چاہتی ہی نہیں ہیں کہ یہ شادی ہو۔'' وہ سخت جھنجلاہٹ کا شکار تھی۔

''بری بات ہے صنم، ایسے بدگمان نہیں ہوتے۔ ہوگی ان کی کوئی مجبوری۔'' ارم سنجیدگی سے اسے سمجھانے لگی۔

''کوئی مجبوری نہیں ہے۔ راحم نے خود مجھے بتایا تھا کہ اس کی پھپھو اپنی بیٹی بھائی کے گھر دینے کے چکر میں تھیں اور یہاں رشتے طے کرنے پر خاصی خفا بھی ہوئی تھیں لیکن حشمت انکل نے انہیں یہ کہہ کر خاموش کروا دیا کہ میں زبان دینے کے بعد اپنی بات سے پھر نہیں سکتا۔ اب ظاہر ہے وہ کسی نہ کسی طرح روڑے اٹکا کر اپنے دل کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش تو کریں گی ہی۔'' اس کا کیا انکشاف دلچسپ تھا لیکن ارم نے زیادہ توجہ نہیں دی اور اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتی رہی کہ فی الحال تو اپنا موڈ ٹھیک کرلے تاکہ مہمان خواتین کو کچھ محسوس نہ ہو آخر کار اسے یہ بات سمجھ آگئی چنانچہ جب خواتین انہیں مٹھائی کھلانے وہاں آئیں تو وہ کافی بہتر موڈ میں روایتی انداز میں شرمائی ہوئی اور خاموش بیٹھی تھی۔

***

اسے اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کو خوب نمایاں کرکے شہر کے مصروف چوراہے پر بیٹھتے جانے کتنے ماہ و سال بیت گئے تھے وہ شمار کرنا بھول گیا تھا۔ اس کی آنکھوں نے جو کبھی اپنی محنت کی کمائی سے باعزت زندگی گزارنے کے خواب دیکھے تھے اب ان خوابوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ بس ایک بے حسی سی تھی جو اس نے اپنے اوپر طاری کرلی تھی، سخت سردی کا موسم ہو یا گرمی کا مخصوص وقت پر اس کی جگہ پر پہنچا دیا جاتا اور شام کو میں وہ خوب کمائی کر کے لوٹتا۔ دن بھر کی اس ذلت کے بعد اس کے پاس کتنی رقم جمع ہو جاتی ہے اس نے کبھی جاننے کی زحمت نہیں کی تھی۔ یہ اس کا باپ جامو ہی تھا جو ملنے والی رقم کا حساب کتاب کرتا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس رقم میں سے اس کے باپ کا حصہ کتنا ہوتا تھا اور سردار کا کتنا۔ وہ تو اس رقم کو بھی بے دلی سے ایک ڈبے میں ڈال کر رکھ دیتا تھا جو کبھی کبھار اس کا باپ جامو معمول سے زیادہ آمدنی ہونے کی صورت میں خوش ہوکر عنایت کر دیتا تھا۔ دن بھر جس روپے کے حصول کی خاطر اسے ایک چوراہے پر ذلت آمیز طور پر پڑا رہنا پڑتا حقیقتاً خود اسے اس رقم کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اب تھا کہ اب زندگی کپڑے کے چند چیتھڑوں اور روٹی کے ٹکڑوں کا ہی نام رہ گئی تھی اس لیے اس سے کیا فرق تھا کہ وہ دن بھر میں کتنا کما لیتا ہے۔ بے خواب آنکھوں کے لیے سب کچھ بے معنی ہوگیا تھا اور اب محض زندگی کے دن ہی پورے کرنے تھے۔ خود اس کے ماں باپ کا حال تھا کہ وہ اوّل، اوّل تو اس کی ٹانگ کٹنے پر دکھی ہوئے لیکن وقت کے ساتھ برستے پیسے نے ان کے آنسو خشک کر دیے۔ چھوٹا روشو تو فطرتاً تھا ہی بے حس۔ اسے اپنے بڑے بھائی کے معاملات سے کبھی کوئی غرض نہیں رہی تھی اور وہ زیادہ تر اس فکر میں ہلکان رہتا تھا کہ کس طرح خود کو ہونے والی آمدنی میں ڈنڈی مار کر باپ سے چھپا سکے۔ اس معاملے میں اس کی کئی بار جامو سے بحث بھی ہوئی تھی۔ چھوٹا تھا تو جامو اس پر ہاتھ بھی اٹھا لیتا لیکن پھر جب ایک بار اپنے سے زیادہ طاقتور اور توانا روشو نے اس کا ہاتھ پکڑا تو اس نے دوبارہ یہ غلطی نہیں کی اور زبانی برا بھلا کہنے پر اکتفا کرتا رہا۔ ہاشو اور باقی سب گھر والے جانتے تھے کہ وہ اتنی کم عمری میں ہی چرس بھی پینے لگا ہے اور اسی مقصد کے لیے اسے زیادہ روپوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے ان کی برادری میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ سڑکوں اور گلیوں میں پل کر آزادانہ جوان ہونے والے بچے اکثر ایسی بری لتوں میں مبتلا ہو جاتے

تھے۔ ہاشو نے چند بار کوشش کی تھی کہ روشو کو اس بری عادت سے باز رہنے کی تلقین کرے لیکن اس کے جارحانہ د گستاخانہ رویے کی وجہ سے چپ رہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ یوں اس کی زندگی کے بے رونق و بے رنگ دن ایک، ایک کر کے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ اسے اپنا آپ کسی ساکت جھیل کے مانند لگنے لگا تھا اور اس جھیل میں پہلا پتھر اس وقت گرا جب گھر میں اس کی شادی کا ذکر چھڑا۔

''اے ہاشو کے ابا! میں سوچو ہوں کہ غلامو سے کل کر کے اب بجو کو اپنے گھر لے آؤں۔ اپنا ہاشو اب جوان ہو گیا ہے اس کا اب بیاہ ہو جانا چاہیے۔'' یہ اس کی ماں پینو تھی جس نے ایک روز رات کا کھانا کھاتے ہوئے یہ بات چھیڑی تھی۔ ماں کی بات سن کر اسے یاد آیا کہ بجو اس کی بچپن کی منگ ہے، وہ بھی ایسی حسین و جمیل کہ گدڑی کا لعل کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔

''اب بھی خالی سوچ ہی ہے۔ ارے میں بولتا ہوں ابھی چلتے ہیں غلامو کے پاس اور اگلے چاند کی تاریخ لے کر آ جاتے ہیں۔'' جامو کو پینو سے بھی زیادہ جلدی تھی۔

''پر بیاہ سے پہلے دلہن کے لیے کمرا بھی تو بنانا ہو گا۔'' جامو کی عجلت پر پینو نے اسے دھیان دلایا۔

''تو، تو ایسی فکر کر رہی ہے جیسے تیری نوں ٹرک بھر کے دہیج (جہیز) لانے والی ہے۔ ڈلوا دیں گے پیچھے کی طرف ایک کچا کوٹھا۔ ہم فقیروں کی اولاد کو زیادہ عیش کی عادت نہیں ہوتی۔'' جامو نے بڑی بے پروائی سے بیوی کی بات کا جواب دیا تو وہ قائل ہو کر آگے کا پروگرام طے کرنے لگی جبکہ ہاشو ان کی باتوں سے بے نیاز اپنی ہی سوچوں میں مبتلا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ حسین و جمیل بجو اس جیسے لنگڑے کے ساتھ شادی کے لیے راضی بھی ہو گی یا نہیں۔ یہ ٹھیک تھا کہ ان کی برادری میں منگنیاں توڑنے کا رواج نہیں تھا اور لڑکی کا نام ایک بار جس لڑکے کے ساتھ جڑ جاتا تھا ہر حال میں اسی سے بیاہی جاتی تھی لیکن بجو کے بارے میں اس نے سنا تھا کہ بڑی نخریلی ہے اور کسی کو منہ نہیں لگاتی۔ ایسی نخریلی لڑکی مجبوری میں اس کے ساتھ شادی کر بھی لیتی تو خوش تو ہرگز نہ رہتی۔ اپنی ان سوچوں اور فکروں میں مبتلا اس نے بجو سے ملاقات کا فیصلہ کر ڈالا۔ برادری کے کھلے ڈھلے ماحول میں یہ ملاقات کوئی ایسی مشکل بھی نہیں تھی۔

''بجو میں تجھ سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ تجھے مجھ سے بیاہ کرنے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے اگر ہے تو مجھے بتا دے، میں ساری بات خود پر لے کر آپ انکار کر دوں گا۔'' اس نے دوپٹا انگلیوں میں لپیٹتی بجو کے حسن سے نظر چراتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

''وے کیوں کر دے گا تو انکار؟ مرد ہو کر اپنی بچپن کی منگ کو چھوڑ دے گا؟'' اس کی بات سن کر بجو نے شرمانا لجانا چھوڑا اور پھاڑ کھانے والی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔

''یہ بات نہیں ہے۔'' وہ بجو کا جارحانہ انداز دیکھ کر ذرا سا گھبرایا۔ ''میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ تو اتنی سوہنی ہے کیا پتا تجھے مجھ جیسے لنگڑے کے ساتھ بیاہ کرنا اچھا نہ لگ رہا ہو تو میں تو بس تیری مدد کے لیے...... تیرے خیال سے کہہ رہا تھا۔'' وہ گڑبڑا کر جلدی جلدی وضاحت کرنے لگا۔

''وے ہاشو گل سن، ابھی تو بجو کو چنگی طرح جانتا نہیں ہے۔ میں نے اگر انکار کرنا ہوتا تو ڈنکے کی چوٹ پر کر دیتی، تیری مدد اور سہارے کی لوڑ نہیں ہے مینو۔ پر میں انکار کروں ہی کیوں؟ مجھے ملوم ہے کہ تو میرا منگیتر ہے، اور میں تجھے خوابوں میں دیکھ دیکھ کر چھوٹی سے بڑی ہوئی ہوں۔ تیرے لیے میں نے خود کو زمانے سے بچا کر رکھا ہوا ہے اور تو کہتا ہے کہ لنگڑا ہونے کی وجہ سے میں تجھے چھوڑ سکتی ہوں۔ لے بھلا ایسے کیسے چھوڑ سکتی ہوں اور میرے نصیب میں لنگڑے کی ووہٹی بننا لکھا ہے تو وہ تو بیاہ کے بعد بھی ہو سکتا تھا ناں تو کیا تب بھی میں تجھے چھوڑ دیتی۔ چل جا پاگلے، بیکار کی گلاں میں اپنا مغز نہ کھپا۔ خوش ہو اور تیرے سوا کسی دوجے کا سوچ نہیں سکتی۔'' اس نے بہت واضح لفظوں میں اپنے جذبات کا اظہار کر ڈالا تو برسوں سے آزردہ ہاشو کے دل کی کلی کھل اٹھی۔

''تو نے میرے دل پر سے بڑا بوجھ ہٹا دیا بجو۔'' خوش ہو کر بجو سے بولا۔

''بس جانے دے، میں تو جانے کیا، کیا سوچ کر ملنے آئی تھی۔ سوچ رہی تھی تجھ جیسے کھسور کو بھی بیاہ کی خبر چھڑنے پر کچھ ہوش آ ہی گیا لیکن تو، تو رشتہ ہی ختم کرنے کی گل کر رہا تھا۔'' وہ شکوہ کرنے لگی۔

''تیرے سارے شکوے بیاہ کے بعد دور کر دوں گا اور اتنا چاہوں گا کہ تو گھبرا جائے گی۔'' دل پر سے بوجھ ہٹا تو لہجہ بھی شوخ ہو گیا۔

[اس کا] تو لہجہ بھی شوخ ہو گیا۔ اس شوخی پر بے باک بجو یک دم ہی شرما گئی اور الٹے قدموں واپسی کے لیے بھاگی۔ اس کی اس شرماہٹ اور گھبراہٹ پر ہاشو کے دل کی سوکھی زمین پر خوشی کی پہلی بوند ٹپکی اور برسوں سے مسکراہٹ سے ناآشنا اس کے ہونٹ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

***

''ارے بھابی! بچیوں کو شاپنگ پر لے جانے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ آپ ماشاء اللہ سوجھ بوجھ والی خاتون ہیں۔ بچیوں کے لیے جو کچھ لے کر آئیں گی وہ اچھا ہی ہو گا۔ میرے حساب سے تو دونوں کو ساتھ لے جانا بیکار ہی ہے۔'' مسز حشمت اس مطالبے کے ساتھ افضل علی کے گھر آ کر بیٹھی ہوئی تھیں کہ شادی کی خریداری کے لیے دونوں لڑکیوں کو اپنے ساتھ بازار لے کر جائیں گی۔ ان کے طبقے میں چونکہ ابھی ایسا کوئی رواج نہیں تھا اس لیے جمیلہ کو یہ بات انہونی لگی تھی اور انہوں نے گھبرا کر انکار کر دیا۔

''آج کل ہمارا آپ کا حساب کہاں چلتا ہے۔ یہ نئے زمانے کے بچے ہیں اور ہماری پسند ناپسند پر بھروسا نہیں کر سکتے۔ راحم نے خاص طور پر مجھے تاکید کی ہے کہ اس کی کپڑوں اور زیور کی خریداری صنم کی پسند سے کیجیے گا ورنہ ایسا نہ ہو کہ آپ ہزاروں روپے خرچ کر کے جو کچھ لیں وہ بعد میں اسے پسند نہ آئے جب پہننا اسے ہے تو پسند بھی اس کی ہونی چاہیے۔ میں اس کی بات سن کر ڈر گئی بعد سوچا کہ صنم اور ارم دونوں کو ساتھ لے جا کر خریداری کروا دوں عاصم تو خیر ان معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتا لیکن بھئی میں انصاف کی قائل ہوں جب ایک بہو کو اس کی پسند کی خریداری کرواؤں گی تو دوسری کو کیوں نہیں، میرے لیے تو اپنے دونوں بیٹے برابر ہیں۔'' جمیلہ کے انکار پر انہوں نے سارا قصہ کہہ سنایا جسے سن کر جمیلہ کچھ اور کھسیا گئیں۔

''مجھے یہ بات بالکل مناسب نہیں لگ رہی بھابی۔ راحم کو بھی ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میری بیٹیاں قناعت پسند ہیں۔ آپ جو کچھ لائیں گی وہ اسے دل سے قبول کریں گی اور آپ کو کسی قسم کا شکوہ و شکایت سننے کو نہیں ملے گا۔ آپ اطمینان سے اپنی پسند سے خریداری کریں میرا جب آپ کے گھر آنا ہوا تو راحم بیٹے کو بھی سمجھاؤں گی کہ آپ سے ایسی باتیں نہ کیا کرے۔ جو ماں اتنے ارمان سے بیٹوں کی شادی کرنے جا رہی ہے وہ بھلا ڈھنگ کی بری کیوں تیار نہیں کرے گی۔'' اس بار انہوں نے بالکل صاف انکار کر دیا جسے سن کر مسز حشمت کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ ظاہر ہے بیٹے کا مطالبہ سن کر ان کے دل میں یہ شک پیدا ہوا ہو گا کہ کہیں اس مطالبے کے پیچھے سسرال والوں کا ہاتھ تو نہیں ہے اب جو یہاں سے انکار ہوا تو ان کا یہ شک دور ہو گیا اور وہ خوش نظر آنے لگیں۔ اپنے خوشگوار موڈ کی وجہ سے انہوں نے چائے اور دیگر لوازمات نوش کرتے ہوئے جمیلہ کو بتانا شروع کر دیا کہ وہ دونوں لڑکیوں کی بری میں کیا کچھ رکھنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ جمیلہ کے خیال کے مطابق وہ سب بہت مناسب تھا ویسے بھی ان کے نزدیک چیزوں کی حیثیت ثانوی تھی اور اصل اہمیت اس بات کی تھی ان کی بیٹیاں اپنے گھروں میں ہنسی خوشی بس سکیں۔ انہوں نے مسز حشمت کے سامنے بھی باتوں، باتوں میں اپنے ان خیالات کا اظہار کر دیا جس کی انہوں نے پرزور تائید کی۔ باہمی اعتماد اور یگانگت کی اس فضا میں بیٹھ کر انہوں نے باتوں' باتوں میں جمیلہ سے دونوں لڑکیوں کی پسند اور ناپسند کے بارے میں کافی معلومات حاصل کر لیں۔ جمیلہ سمجھ دار تھیں چنانچہ بہت طریقے سے انہیں بتاتی رہیں کہ کسے کون سے رنگ پسند ہیں اور کون کیسے لباس پہننا پسند کرتی ہے۔ گفتگو کے اختتام پر جب مسز حشمت بے حد خوشگوار موڈ میں اپنے گھر کے لیے روانہ ہوئیں تو جمیلہ کو پورا اطمینان تھا کہ وہ جو بری تیار کریں گی ان کی بیٹیوں کے ذوق کے عین مطابق ہو گی۔ سمدھن کو گرم جوشی کے ساتھ رخصت کر کے وہ مگن سی اندر آئیں تو صنم کے پھولے ہوئے منہ کا سامنا کرنا پڑا۔

''جب آنٹی خود ہمیں اپنے ساتھ شاپنگ کے لیے لے جانے کی بات کر رہی تھیں تو آپ نے انہیں منع کیوں کیا امی؟'' ماں کی شکل دیکھتے ہی اس نے شکوہ کیا۔

''مجھے مناسب نہیں لگا اس لیے میں نے منع کر دیا اور میرے خیال میں اسی میں تم دونوں کی بھلائی بھی ہے۔'' اس کے قدرے گستاخانہ لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے نرمی سے جواب دیا۔

''وہ لے آئیں گی ہمارے لیے پرانے فیشن کے

اور نگے بوگے کپڑے اور زیور اور یہ آپ کو بہت اچھا لگے گا۔“ وہ خاصی جھلائی ہوئی تھی۔

”کپڑوں اور زیور سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ تمہاری ساس کے دل میں تمہارے لیے میل نہ آئے اور میں مطمئن ہوں کہ وہ یہاں سے خوش باش واپس گئی ہیں۔“ جمیلہ نے ایک بار پھر اس کی گستاخی کو نظر انداز کیا۔

”ہونہہ، میل نہ آئے۔ آج تک آپ نے دنیا میں ایسی کوئی ساس دیکھی ہے جس کے دل میں بہوؤں کے لیے میل نہ ہو۔ آپ کتنی بھی اچھی بننے کی کوشش کرلیں، دیکھ لیجیے گا شادی کے تھوڑے عرصے بعد یہی آنٹی ہم میں سو سو کیڑے نکال رہی ہوں گی۔“

”اگر تم میری تربیت کے مطابق نہیں رہیں تو واقعی وہ تم میں کیڑے نکالیں گی اور میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہارے رنگ ڈھنگ ایسے ہوتے جارہے ہیں جنہیں کوئی بھی بزرگ پسند نہیں کرسکتا۔“ اس بار جمیلہ نے اسے سختی سے جواب دیا اور پھر ذرا دھیمی پڑ کر سمجھانے لگیں۔

”میری بات ہمیشہ یاد رکھنا بیٹا! سسرال میں وہی لڑکیاں سکون سے رہتی بستی ہیں جو چھوٹے چھوٹے معاملات پر سمجھوتا کرنا جانتی ہیں خاص طور پر سفید پوش گھرانوں کی بیٹیوں کو ایسے سمجھوتے بہت زیادہ کرنے پڑتے ہیں۔ تم صرف دو بہنیں ہی ہو۔ تمہارے پیچھے کوئی بہت مضبوط میکا نہیں ہے جو سسرال سے بگاڑ کرنے کی صورت میں تمہاری پشت پناہی کرسکے۔ ہم غریب اور اصول پسند لوگ ہیں اور ایسی کسی حرکت پر تمہاری طرف داری ہرگز نہیں کریں گے جہاں تم کسی بڑے کے مقابل کھڑی ہو کر گستاخی کروگی اس لیے بہتر ہے کہ ابھی سے دوسروں کو عزت اور اہمیت دینا سیکھ لو آگے اللہ خود تمہیں اور خوشیوں بھری زندگی سے نوازے گا۔“ وہ نرمی و گرمی سے کام لے کر جو کچھ بیٹیوں کو سمجھا سکتی تھیں سمجھا کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ارم تو شروع ہی سے بالکل خاموش تھی ان کا موڈ دیکھ کر صنم کو بھی خاموشی اختیار کرنی پڑی۔

”پتا نہیں کس زمانے کی سوچیں ہیں ہماری والدہ صاحبہ کی۔ اتنی بوڑھی بھی نہیں ہیں لیکن خیالات بالکل پچھلی صدی کی دادی اماؤں والے ہیں۔“ جمیلہ کے باہر نکل جانے کے بعد صنم نے بڑبڑانا شروع کردیا۔

”تم کتنی بدتمیز ہوگئی ہو صنم، پہلے تو تم ایسی نہیں تھیں اور امی کی ہر بات خاموشی سے مان لیتی تھیں۔“ اس کے خیالات سن کر ارم نے اسے ڈپٹتے ہوئے تاسف کا اظہار کیا۔

”پہلے میں کنویں کی مینڈک جو تھی۔ راحم نے مجھے دنیا کے رنگ دکھائے ہیں اور بتایا ہے کہ میں کیا ہوں۔“ اس نے اترا کر جواب دیا۔

”کیا چیز ہو تم؟ مجھے تو ایسی کوئی خاص بات نظر نہیں آتی تم میں۔ وہی عام سا ناک نقشہ ہے جو بہت سی لڑکیوں کا ہوتا ہے۔“ وہ دونوں بہنیں خاصی خوش شکل تھیں لیکن گھر کا ماحول ایسا تھا کہ کبھی اس بات کو اہمیت نہیں دی گئی تھی چنانچہ انہیں خود بھی زیادہ احساس نہیں تھا لیکن اب صنم کا مزاج بدلنے لگا تھا اور یہ بات ارم کو بھی اچھی نہیں لگی تھی۔

”تمہیں نظر آئے نہ آئے راحم کو تو مجھ میں خاص بات نظر آتی ہے ناں اور تم دیکھنا کہ راحم اب میرے لیے کیا کرتا ہے۔“ صنم نے دعویٰ کیا اور چند دن بعد اس دعوے کو ثابت بھی کر دکھایا۔

”راحم کے ساتھ جاکر رابی سینٹر اور حیدری سے اپنے لیے اتنے زبردست سوٹ لائی ہوں، تم دیکھوگی تو آنکھیں کھلی رہ جائیں گی اور پچھتاؤ گی کہ تم نے بھی میری طرح عاصم بھائی کو اپنے کنٹرول میں کرکے کیوں نہیں رکھا۔“ وہ معمول کے مطابق چوری چھپے راحم کے ساتھ باہر گئی اور جب واپس آئی تو ارم کو مزے لے لے کر بتانے لگی۔

”مجھے کپڑوں لتوں کا ایسا کوئی شوق نہیں ہے جس کے لیے کسی کو قابو میں کرنے کی کوشش کروں...... لیکن تم یہ بتاؤ کہ اپنی ان حرکتوں کا نتیجہ سامنے آنے پر کیا کروگی؟“ ارم کا میڈیکل میں ایڈمیشن ہوگیا تھا اور وہ سنجیدگی سے پڑھائی میں مصروف رہتی تھی۔ یہاں بھی شادی کی جو تیاریاں چل رہی تھیں اس میں صنم ہی جمیلہ کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ اس وقت بھی اس نے کچھ نوٹس پر کام کرتے ہوئے... صنم کو اس کی غلطی کا احساس دلانے کی کوشش کی تھی۔

”کچھ نہیں ہوگا، راحم میرا نام ہی نہیں لے گا، وہ آنٹی سے کہہ دے گا کہ اس نے اپنی ہونے والی بیوی کے لیے اپنی پسند سے خریداری کی ہے۔ اب تم ہی سوچو

جب میں درمیان میں نظر ہی نہیں آؤں گی تو آنٹی میرے خلاف کیا سوچ سکیں گی؟“ اس نے ایک آنکھ دبا کر پالا کی سے کہا تو ارم نے اسے افسوس سے دیکھا۔

”بے وقوف لڑکی! تم اتنی سی بات کیوں نہیں سمجھتی ہو کہ اگر بیٹا ماں سے بغاوت کرے تو وہ آٹومیٹکلی بہو سے بدظن ہو جاتی ہے۔ صرف چند جوڑوں اور جیولری کی خاطر اپنی ہونے والی ساس کے دل میں شادی سے پہلے اپنے لیے گرہ ڈال دینا کہاں کی دانشمندی ہے؟ وہ تو پہلے دن سے تمہیں اپنے لیے خطرہ سمجھنے لگیں گی۔“

”وہ جو سمجھتی ہیں سمجھنے دو۔ مجھے حق ہے کہ میں اپنی لائف انجوائے کرسکوں اور دوسروں کے بارے میں سوچ، سوچ کر میں اپنے اس حق سے دستبردار نہیں ہوسکتی۔ میرے لیے بس اتنا اطمینان کافی ہے کہ راحم میرا ہے اور میرے سارے ناز نخرے اٹھا سکتا ہے۔“ اس نے بات ہی ختم کردی تو ارم نے بھی بحث کو فضول جان کر سر جھٹکتے ہوئے دوبارہ اپنے کام کی طرف توجہ مبذول کرلی۔

***

ہاشو، سجو کو پاکر بہت خوش تھا۔ وہ اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی اور کبھی احساس نہیں ہونے دیتی تھی کہ ایک ٹانگ سے محروم ہونے کی وجہ سے وہ اس سے کمتر ہے۔ شادی کے بعد تقریباً پورا ہفتہ انہوں نے دھندے سے چھٹی کی تھی اور ہفتہ بھر بعد جب انہیں دوبارہ کام پر جانا پڑا تو ہاشو کی ساری خوشی کافور ہوگئی۔ اپنے مخصوص چوراہے پر پڑا وہ دن بھر یہی سوچ سوچ کر بے چین ہوتا رہا کہ اس کی حسین و جمیل بیوی بھیک مانگنے کے چکر میں نہ جانے کن کن اوباش فطرت لوگوں سے نمٹ رہی ہوگی۔ دھندے سے واپس آنے کے بعد بھی وہ اسی وجہ سے چپ چپ رہا۔ سجو نے اس سے اس کی خاموشی کی وجہ دریافت کی تو اس کے سامنے وہ اپنی پریشانی کی وجہ بیان کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ وجہ سن کر وہ ایک پل کے لیے تو خاموش ہوگئی لیکن پھر لہجے میں بے پروائی سموتے ہوئے چہک کر بولی۔

”کسی مائی کے لال میں اتنی جرأت نہیں کہ سجو کو انگلی بھی لگا سکے۔ اپنی طرف بری نظر سے دیکھنے والے کی آنکھیں پھوڑ ڈالوں گی میں...... تو ایویں اتنا فکرمند ہو رہا ہے۔ میں کون سا دھندے پر سج سنور کر جاتی ہوں۔ ایسے گندے مندے حال میں تو کسی کو میری شکل سمجھ بھی نہیں آتی ہوگی۔“ ان جملوں سے اس نے اپنے طور پر تو ہاشو کی تسلی کروا دی تھی لیکن وہ مطمئن نہیں ہوسکا تھا۔ اسے سجو کے کردار پر کوئی شک نہیں تھا اور جانتا تھا کہ وہ واقعی اتنی آسانی سے کسی کے قابو میں آنے والی نہیں ہے لیکن تھی تو بہرحال کمزور عورت جو بس ایک حد تک ہی اپنے دفاع کے لیے لڑ سکتی تھی۔ نفرت تو پہلے بھی وہ اپنے پیشے سے کرتا تھا لیکن ٹانگ کاٹے جانے کے بعد اس نفرت پر خوف حاوی ہوگیا تھا۔ اب دل میں وسوسوں نے جنم لیا تو وہ نفرت ایک بار پھر ابھرنے لگی۔ سونے پر سہاگہ ان کی برادری میں ان ہی دنوں ایک اندوہ ناک سانحہ بھی پیش آگیا۔ نوری نام کی وہ لڑکی بہت زیادہ خوب صورت نہیں تھی۔ کم از کم سجو کے مقابلے میں تو کچھ بھی نہیں تھی لیکن اس کی جوانی ہی اس کے لیے مصیبت بن گئی۔ اسے چند اوباش لڑکوں نے اغوا کرنے کے بعد پوری رات بری طرح بے آبرو کیا اور صبح نیم مردہ حالت میں ایک ویرانے میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ رات بھر اس کی تلاش میں مارے مارے پھرتے برادری کے مردوں کے مختلف گروہوں میں سے جب وہ ایک گروہ کو ملی تو پوری برادری میں طیش کی لہر دوڑ گئی۔ سردار کے پولیس والوں سے گہرے مراسم تھے اور وہ اپنا دھندا جاری رکھنے کے لیے پولیس سمیت دیگر اعلیٰ عہدے داران کو ٹھیک ٹھاک نذرانے دیا کرتا تھا برادری والوں کی اشک شوئی کے لیے اس نے بہت ہاتھ پیر مارے کہ کسی طرح مجرموں تک پہنچ سکے لیکن زیادتی کا شکار ہونے والی لڑکی کی ذہنی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ مجرموں کی نشاندہی کرسکتی اور پولیس کا کہنا تھا کہ جب تک ہمیں کوئی کلیو نہیں ملتا ہم کچھ کیسے کرسکتے ہیں یوں معاملہ آسانی سے دب گیا۔ ہاشو کو شک تھا کہ پولیس کی اس سستی کے پیچھے نوری کی خاموشی کے علاوہ بھی کوئی وجہ ہے۔ شاید وہ لڑکے اتنے بارسوخ تھے کہ پولیس ان پر ہاتھ ڈال ہی نہیں سکتی تھی چنانچہ اس نے نامعلوم ملزمان کے نام الزام ڈال کر اپنی جان چھڑالی۔ اس واقعے نے اسے بے حد اداس اور دلگرفتہ کردیا۔ اس بار سجو بھی خاموش تھی اور جب ہاشو نے اس حوالے سے اس سے بات کی تو اس نے اعتراف کیا کہ بعض اوباش فطرت لوگ واقعی بھیک مانگنے والی جوان عورتوں کو تنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بہادر ہونے کے باوجود

اسے ایسے لوگوں سے ڈر لگتا ہے۔ اس موقع پر اس نے دبے لفظوں میں ہاشو کو یہ بھی بتایا کہ باہر کے اوباش تو اپنی جگہ تھے ہی لیکن وہ اپنے دیور روشو سے بھی خوف زدہ تھی۔ جو اسے غلیظ نظروں سے گھورنے کے علاوہ موقع دیکھ کر ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ بھی کرلیتا تھا۔ ان انکشافات نے ہاشو کو طیش میں مبتلا کر دیا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ روشو کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ معذوری نے اسے اس قابل ہی نہیں چھوڑا تھا کہ وہ کسی سے دوبدو مقابلہ کر پاتا بس ایک جلن اور کھولن تھی جو اندر ہی اندر اسے تڑپائے جارہی تھی اور وہ خود کو اندھیرے جنگل میں کھڑا محسوس کررہا تھا۔ ان ہی دنوں اسے علم ہوا کہ بجو امید سے ہے، اس خبر کو سن کر خوش ہونے کے بجائے وہ مزید پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ اب تک تو اسے صرف بجو کی عزت کی فکر تھی اب یہ فکر بھی ستانے لگی کہ اگر اللہ نے اولاد کی صورت میں اسے بیٹی دی تو اس کی بیٹی کا کیا ہوگا۔ کیا وہ بھی سڑکوں پر ہزاروں غلیظ نظروں کو سہتے ہوئے بھیک مانگے گی اور کسی دن نوری جیسے انجام سے دوچار ہو جائے گی؟ یہ خیالات اتنے خوفناک تھے کہ اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ اس نے کوشش کی کہ بجو کی حالت کو جواز بنا کر اسے دھندے پر جانے سے روک دے لیکن اس کا باپ راضی نہیں ہوا۔ اس کے مطابق یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ خود اس کی ماں چنو نے اسی طرح سڑکوں پر رُلتے ہوئے اپنے دونوں بیٹوں کو جنم دیا تھا چنانچہ بجو کے لیے بھی گھر میں رہنا ضروری نہیں تھا ویسے بھی اس کا خیال تھا کہ شادی کے اخراجات اور چھٹیوں کی وجہ سے وہ پہلے ہی خاصا نقصان میں ہے اور اس نقصان کو پورا کرنے کے لیے ان دونوں میاں بیوی کو محنت کرنی ہوگی۔ باپ کے صاف جواب نے اسے بالکل بند گلی میں لا کھڑا کیا لیکن نہیں اس گلی سے ایک راستہ باہر نکلتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ ہتھیار ڈالنے سے پہلے اس راستے سے باہر نکلنے کی کوشش کر دیکھے۔

***

رکشے سے اتر کر اس نے رکشے والے کو کرایہ ادا کیا اور اپنے سامنے موجود گھر کو غور سے دیکھا۔ گھر کی تعمیر میں معمولی سا ردوبدل آیا تھا اور دیواروں پر رنگ بھی اس سے مختلف تھا جو اس نے برسوں پہلے دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے یقین تھا کہ وہ بالکل ٹھیک جگہ پہنچا ہے۔ اس گھر کا راستہ اس کے دل و دماغ پر نقش تھا اور سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ یہاں تک پہنچنے میں اس سے کوئی غلطی ہوئی ہو بس اب سے پہلے وہ ہمت نہیں کر سکا تھا کہ یہاں تک آسکے۔ اتنے عرصے بعد ہمت پیدا ہوئی تھی تو اس لیے کہ وہ اپنی اولاد کو برے انجام سے بچانا چاہتا تھا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے کال بیل کا بٹن دبایا۔

''جی، آپ کو کس سے ملنا ہے۔'' دروازہ چودہ پندرہ سالہ ایک لڑکے نے کھولا اور اپنے سامنے ایک مفلوک الحال شخص کو دیکھ کر ذرا حیرت سے پوچھا۔ ہاشو نے یہاں آتے ہوئے اگرچہ بازار سے نیا لباس خرید کر پہن لیا تھا پھر بھی اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی جس میں پچھلے چند دنوں کی فکر اور پریشانی نے مزید اضافہ کر دیا تھا۔

''مجھے صوفی صاحب سے ملنا ہے۔'' اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے لڑکے کو بتایا۔

''داداجی سے! اچھا آپ کا نام کیا ہے؟'' لڑکا حیرت اور الجھن کا شکار تھا۔

''ہاشو، صوفی صاحب سے کہنا کہ ان سے ہاشو ملنے آیا ہے۔'' پتا نہیں کیوں اسے یقین تھا کہ درمیان میں کئی سال گزر جانے کے باوجود صوفی صاحب نے اسے یاد رکھا ہوگا۔ اس کا یہ یقین اس وقت درست ثابت ہوا جب لڑکا اسے دروازے پر ٹھہرا کر اندر جانے کے بعد دوبارہ واپس آیا۔

''آپ اندر آجائیں، داداجی آپ سے اپنے کمرے میں ملاقات کریں گے۔'' پہلے کے مقابلے میں احترام سے بولتا ہوا وہ اسے اپنے ساتھ گھر کے اندر لے گیا۔ صوفی صاحب بستر پر تکیوں کے سہارے سے بیٹھے ہوئے تھے اور پہلے کے مقابلے میں زیادہ کمزور اور بوڑھے محسوس ہورہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہاشو کا دل بھر آیا اور یوں تڑپ کر ان کے گلے لگا جیسے برسوں بعد اپنی سب سے عزیز ہستی سے مل رہا ہو۔ بڑی مشکل سے صوفی صاحب نے اسے سنبھال کر خاموش کروایا تو اسے یاد آیا کہ وہ یہاں رونے کے لیے نہیں بلکہ ایک خاص مقصد کے تحت آیا ہے۔

''آپ نے کہا تھا کہ کبھی ضرورت محسوس کروں تو آپ کے پاس آسکتا ہوں۔''

''تم نے بڑا انتظار کروایا ورنہ میں نے تو تمہاری بہت راہ دیکھی۔'' وہ مسکرائے۔ وقت نے اگرچہ ان کے چہرے کی جھریوں میں اضافہ کر دیا تھا لیکن مسکراہٹ ویسی ہی روشن اور پُرنور تھی۔

''پیروں نے ہی ساتھ چھوڑ دیا تھا تو میں کسی راہ پر کیا چلتا بس قسمت کے ہاتھوں رُلتا رہا۔'' وہ ایک بار پھر آبدیدہ ہو گیا۔

''بری بات قسمت کو نہیں کوستے۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ اللہ نے تمہارے لیے اپنے پاس بہتری رکھی ہوئی ہے لیکن پہلے تم بتاؤ کہ گزرے برسوں میں تم پر کیا بیتی؟'' انہوں نے اسے ٹوکنے کے ساتھ ہی دریافت کیا تو وہ انہیں تمام حالات بتاتا چلا گیا۔ صوفی صاحب توجہ سے اس کی بات سنتے رہے۔ اس دوران ان کا پوتا ٹھنڈے میٹھے شربت سے بھرے گلاس وہاں پہنچا گیا تھا۔ صوفی صاحب کے حکم پر ہاشو کو درمیان میں وہ شربت بھی پینا پڑا۔

''میں شاید بہت پہلے آپ کے پاس آجاتا صوفی صاحب لیکن ٹانگ کٹ جانے کے بعد حوصلہ ہی ٹوٹ گیا پھر وہ لوگ میری نگرانی بھی کرتے تھے، اس لیے میں ڈر کر دوبارہ بغاوت کی ہمت ہی نہیں کر سکا لیکن اب......

اب اپنی اولاد کی خاطر ایک کوشش اور کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے گلوگیر لہجے میں ان سے کہا تو انہوں نے شفقت سے حوصلہ دینے والے انداز میں اس کا شانہ تھپتھپایا اور ذرا سے توقف کے بعد بولے۔

''میرے لیے جو ممکن ہوا میں ضرور تمہارے لیے کروں گا لیکن اس کے لیے تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ تم مجھے اس جگہ کا پتا لکھوا دو جہاں آج کل تم ہوتے ہو، میں پیغام بھیج کر خود بلوالوں گا۔''

ہاشو نے انہیں چوراہے کے بارے میں بتا دیا اور دل میں بڑی آس اور امید لیے ان سے رخصت ہو گیا۔ انتظار کے دو دن اس نے سولی پر لٹکتے ہوئے گزارے۔ بجو اس کی ہمراز تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ ہاشو نے اسے برسوں پہلے صوفی صاحب سے سنی احادیث بھی سنائی تھیں اور احساس دلایا تھا کہ وہ کتنی شرمناک زندگی گزار رہے ہیں۔ بجو کے لیے تو سب کچھ ہاشو تھا وہ کچھ سمجھتی یا نہ سمجھتی لیکن اتنا سمجھتی تھی کہ ہاشو کی خوشی میں ہی اس کی خوشی ہے۔ اس لیے اس کی خاطر ہر قدم اٹھانے کو تیار تھی۔ دو دن بعد صوفی صاحب نے پیغام بھیج کر دونوں میاں بیوی کو اپنے گھر بلوایا تو وہ پورا انتظام کر چکے تھے۔

''شوکت خان میرا شاگرد ہے، کراچی میں رہتا ہے اور اپنا ذاتی کاروبار کرتا ہے۔ میں نے اس سے تم دونوں میاں بیوی کے لیے بات کرلی ہے۔ وہ تمہیں اپنے گھر میں پناہ اور ملازمت دونوں دے گا۔ تم وہاں جاؤ اور اپنی نئی زندگی شروع کرو۔ پلٹ کر دوبارہ یہاں دیکھنے کی غلطی بالکل نہیں کرنا۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔'' صوفی صاحب نے انہیں اطلاع دی اور اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ دونوں کو ریلوے اسٹیشن بھجوا دیا۔ ریل کے ٹکٹ، صاف ستھرے لباس، کھانے پینے کا سامان اور کچھ رقم پر مشتمل زادِ راہ بھی انہی کی طرف سے مہیا کیا گیا تھا۔ ریل اسٹیشن چھوڑ کر کراچی کی طرف روانہ ہوئی تو بجو اور ہاشو پیچھے ہی کہیں رہ گئے اور ایک نیا جوڑا زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں اور عزت وصول کرنے کے خواب آنکھوں میں سجائے آگے بڑھتا چلا گیا۔

***

''آپ کپڑے تو بدل لیں۔ دولہا والے آتے ہی ہوں گے۔ کتنا برا لگے گا اگر وہ آگئے اور آپ انہی میلے کپڑوں میں ہوئے۔'' آج ارم اور صنم کی بری آنے والی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی طے پایا تھا کہ نکاح بھی آج ہی کے دن کرلیا جائے گا چنانچہ افضل علی کی مصروفیات عروج پر تھیں۔ بیٹا تو کوئی تھا نہیں بس وہ محلے ہی کے چند لڑکوں کی مدد سے سارا انتظام خود سنبھالنے میں مصروف تھے۔ ان کے چہرے پر جہاں تھکن اور لاڈلی بیٹیوں کی جدائی کا غم تھا وہیں اس خوشی کی چمک بھی تھی کہ وہ اپنی بیٹیوں کو عزت سے ان کے گھر کا کرنے جارہے ہیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ خوشی کے اس موقع پر اپنا تن من دھن سب لُٹا ڈالیں۔ وہ تو جمیلہ ہی تھیں جو ان کا خیال رکھ رہی تھیں۔ دوپہر میں بھی انہوں نے ہی زبردستی افضل علی کو کھانا کھلایا تھا اور اب بھی ہوش دلا رہی تھیں کہ مہمانوں کی آمد سے قبل کپڑے تبدیل کرلیں۔

''اچھا جی، جیسا آپ کا حکم۔ ہو جاتے ہیں تیار لیکن ایک بات تو صاف ظاہر ہے۔ ہم کتنے بھی تیار شیار ہو جائیں آپ کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔ آپ تو آج بھی

نوجوانی کی طرح ہی حسین اور دلربا لگتی ہیں۔'' انہوں نے محبت پاش نظروں سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں چھیڑا۔ جمیلہ بہت سادگی پسند خاتون تھیں اور کبھی زیادہ بناؤ سنگار نہیں کرتی تھیں لیکن آج خوشی کے اس موقع پر بیٹیوں کے اصرار پر ہلکی پھلکی تیاری کرلی تھی اور اس معمولی سی تیاری کے نتیجے میں ہی خوب چمک رہی تھیں چنانچہ افضل علی انہیں چھیڑے بغیر نہ رہ سکے۔

''ان باتوں کو جانے دیجیے۔ اب کہاں ہمارا وقت رہا ہے اب تو ہماری بیٹیوں کے دن ہیں۔ ماشاء اللہ دونوں پر اتنا روپ آیا ہے کہ میں تو نظر لگ جانے کے ڈر سے آنکھ بھر کر دیکھ بھی نہیں رہی ہوں۔'' انہوں نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ شوہر کی بات کا جواب دیا اور پھر لہجہ بدلتے ہوئے بولیں۔ ''چلیں بس اب آپ فٹافٹ تیار ہو جائیں۔ میں دیکھتی ہوں کہ لڑکیوں نے پھولوں کے ہار وغیرہ صحیح سے سیٹ کر لیے ہیں یا نہیں۔'' انہوں نے افضل علی کو اندر کا راستہ دکھایا اور خود گھر کے باہر لگے شامیانے میں پہنچ گئیں جہاں ارم اور صنم کی سہیلیوں اور پڑوسی لڑکیوں نے بہنوں کی کمی پوری کر رکھی تھی اور دل جمعی سے ہر کام نمٹا رہی تھیں۔ اصل میں جمیلہ اور افضل علی کا اخلاق شروع ہی سے اتنا بہترین رہا تھا کہ محلے کے ہر گھر سے ان کے اچھے تعلقات تھے اور محلے والے اس موقع پر خوشی سے بڑھ چڑھ کر ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ ان کے انتظامات سے پوری طرح مطمئن ہونے تک افضل علی بھی تیار ہو کر وہاں پہنچ گئے۔ اسی وقت دولہا والوں کی آمد کا غلغلہ اٹھا اور دونوں میاں بیوی آگے بڑھ کر ان کا استقبال کرنے لگے۔ بنے سنورے، ہنستے مسکراتے مہمانوں کا خوش دلی سے استقبال کر کے انہیں احترام کے ساتھ نشستوں پر بٹھایا گیا۔ بڑی عمر کی خواتین سے الگ لڑکیاں بالیاں ایک صاف ستھری چاندنی پر ڈھول سنبھال کر بیٹھ گئیں اور ہنستی ہوئی شادی کے شوخ گیت گانے لگیں۔ اس نکھرے، جگمگاتے ماحول میں جب اچانک ہی ایک میلے کچیلے، مدقوق الحال شخص نے اپنے کاسے سمیت قدم رکھا تو ہر ایک چونک اٹھا۔ ممکن تھا کہ لڑکے اس شخص کو بھکاری جان کر باہر دھتکار دیتے لیکن اس نے کسی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور بلند آواز میں ''باشو، میرے بھائی!'' کہتا ہوا لپک کر افضل علی کے گلے سے لگ کر بلند آواز میں رونے لگا۔ اس کی اس حرکت پر جہاں دوسرے لوگ انگشت بدنداں تھے وہیں افضل علی بھی بالکل سکتہ زدہ رہ گئے تھے اور ان میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ اس شخص کو جھٹک کر خود سے دور کر سکیں۔

''کیا بات ہے بھائی افضل؟ یہ شخص کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے؟'' پریشان حشمت صاحب نے قریب پہنچ کر افضل علی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان سے دریافت کیا۔ ادھر خواتین کے گھیرے میں کھڑی جمیلہ بھی سینے پر ہاتھ رکھے دم بخود کھڑی تھیں۔

''میں اس کا چھوٹا بھائی روشو ہوں۔ ہم ساتھ پل کر بڑے ہوئے ہیں لیکن انیس سال پہلے یہ پتا نہیں کیوں ہمیں چھوڑ گیا تھا اور اب اتنے برسوں بعد ملا ہے۔'' افضل علی کے بجائے روشو نے حشمت صاحب کی بات کا جواب دیا اور پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا۔ ''چل بھائی گھر چل، اماں ابا تو تیرے غم میں روتے روتے مر گئے لیکن میں آج بھی تیرا اور بھرجائی کا راستہ دیکھتا ہوں۔ بھرجائی...... بھرجائی کہاں ہو، ادھر آؤ دیکھو، میں ہوں تمہارا دیور روشو آ کر مجھے پہچانو۔'' وہ درد بھرے انداز میں آوازیں دینے لگا۔

''کیا یہ شخص ٹھیک کہہ رہا ہے افضل علی؟ کیا یہ سچ مچ تمہارا بھائی ہے؟'' حشمت صاحب نے اس بار افضل علی کا شانہ جھنجوڑ ڈالا۔

''میں اسے نہیں جانتا۔ یہ کوئی پاگل ہے جو ایسی باتیں کر رہا ہے۔ میرا اس دنیا میں کوئی عزیز، کوئی رشتے دار نہیں ہے۔'' افضل علی نے آہستہ سے اس کی طرف سے منہ موڑ لیا۔

''ہائے ہائے، کیسا بھائی کا خون سفید ہو گیا ہے۔ آج عزت دار بنا بیٹھا ہے تو اپنے فقیر بھائی سے رشتے سے ہی انکار کر رہا ہے لیکن میں ثابت کر سکتا ہوں کہ یہ میرا سگا بھائی باشو ہے۔ اگر کسی کو یقین نہ آئے تو ابھی آزما لے۔'' وہ چلا چلا کر بتانے لگا کہ اس کے بھائی باشو کے جسم کے کون سے حصے پر کون سا نشان اور کہاں، کہاں کتنے تل ہیں۔ اس کی باتیں سن کر افضل علی لڑکھڑا کر نیچے گر گئے۔

''یہ فقیر سچ کہہ رہا ہے نا، افضل علی؟'' حشمت صاحب نے ان کے قریب بیٹھ کر گمبھیر لہجے میں استفسار کیا۔ جواباً افضل علی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ زبان

سے کچھ کہنے کا تو یارا ہی نہیں تھا۔

''تمہیں مجھ سے اتنی بڑی بات نہیں چھپانی چاہیے تھی افضل علی۔'' ان کا خاموش اعتراف سن کر حشمت صاحب نے پریشانی سے اپنی پیشانی مسلی۔

''توبہ میری توبہ، اتنے دھوکے باز لوگ...... میرا شریف سیدھا سادہ بھائی ان چکر بازوں کے دھوکے میں آ کر ایک نہیں اپنے دو، دو بیٹے اس بھکاری کی بیٹیوں سے بیاہنے چلا تھا۔ ہائے میرے مرحوم اماں ابا...... ہمارے نجیب الطرفین خاندان کی عزت کو یہ کیسا بٹا لگنے جا رہا تھا۔ ارے میرے بھولے بھیا...... یہ تم نے کیا، کیا؟ بغیر چھان بین کیے اپنے بیٹوں کے رشتے ان بھیک منگوں کے خاندان میں کر دیے۔ میرے ماں باپ کی روحیں آج کتنی بری طرح قبروں میں تڑپ رہی ہوں گی۔'' حشمت صاحب کے کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے ہی ان کی بہن نے واویلا شروع کر دیا۔

''میری بیٹیاں بے قصور ہیں حشمت بھائی! میرا تعلق کسی بھی خاندان سے سہی لیکن میں نے ان کی تربیت بہت اچھے طریقے سے کی ہے۔ یہ کبھی آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دیں گی۔'' خوف زدہ افضل علی نے حشمت صاحب کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''اب اور پٹیاں نہ پڑھاؤ میرے بھولے بھائی کو۔ تم نے تو پہلے ہی ہمارے خاندان کے منہ پر کالک مل دی ہے اب کیا چاہتے ہو کہ ہم تمہارے گھر کی گند سمیٹ کر اپنے گھر لے جائیں۔'' حشمت صاحب کمزور نہ پڑ جائیں اس لیے ان کی بہن خم ٹھونک کر ایک بار پھر میدان میں اتر پڑیں۔

''ہمارے واپس چلے جانے سے افضل انکل کی بیٹیوں کی زندگی تباہ ہو جائے گی ابو۔ آپ کو کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اطمینان سے بیٹھ کر ان کی بات سننی چاہیے۔'' عاصم باپ کے قریب کھڑا ہو کر دھیمی آواز میں انہیں سمجھانے لگا جس پر افضل علی نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔

''نہیں ابو، کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں اب اس گھر میں رشتہ نہیں جوڑنا چاہتا ورنہ کل کو یہی تماشا ہمارے گھر میں بھی ہو سکتا ہے۔ آپ واپس چلنے کی تیاری کریں۔'' ابھی وہ ایک بیٹے کی بات پر غور نہیں کر سکے تھے کہ دوسرا درمیان میں کود پڑا۔ پھر مسز حشمت بھی آ گئیں جو اپنی نند اور راحم کی ہمنوا تھیں۔ آناً فاناً ماحول ایسا بدلا کہ ان لوگوں نے واپس جانے کا فیصلہ سنا دیا۔ کچھ لوگوں نے کوشش بھی کی کہ کسی طرح معاملہ رفع دفع ہو جائے لیکن جب ایک دولہا، اس کی ماں اور دوسرے قریبی عزیز سمجھوتے پر راضی نہیں تھے تو کیسے جانے والوں کو روکا جا سکتا تھا۔ ایک، ایک کر کے سب وہاں سے رخصت ہو گئے اور خوشی کا گھر ماتم کدہ بن کر رہ گیا۔ روشو جو اس چمن میں چنگاری پھینک کر آگ بھڑکا گیا تھا جانے کب اور کہاں وہاں سے غائب ہو گیا تھا۔

***

''ہم اپنا شہر چھوڑ کر کراچی پہنچے تو صوفی صاحب کے شاگرد شوکت خان کے گھر ہمارا بہت کھلے دل سے استقبال کیا گیا۔ شوکت خان صاحب نے ہر قدم پر ثابت کیا کہ وہ واقعی صوفی صاحب کے قابلِ فخر شاگرد ہیں۔ کہنے کو ہم ان کے گھر ملازم تھے اور سرونٹ کوارٹر میں رہتے تھے لیکن ان کا سلوک ہمارے ساتھ بہت اچھا تھا۔ تمہاری امی کی حالت اور میری معذوری کی وجہ سے ہم سے زیادہ سخت کام بھی نہیں لیے جاتے تھے۔ ہم نے باشو اور بجو سے افضل علی اور جمیلہ بننے کے تمام مراحل ان کی کوٹھی میں ہی طے کیے۔ ان کی بیگم نے کمالِ مہربانی سے ہمیں مہذب لوگوں کی طرح اٹھنا بیٹھنا، بولنا اور پڑھنا سکھایا۔ تم دونوں کی پیدائش انہی کی کوٹھی میں ہوئی اور شوکت صاحب نے ہی میری مصنوعی ٹانگ لگوا کر مجھے نارمل زندگی سے قریب ہونے کا موقع دیا۔ ان دونوں میاں بیوی کے ہم پر اتنے احسانات تھے کہ ہم آخری سانس تک ان کی خدمت کرنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کی خواہش پر ملائشیا شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا تو مجبوری میں ہمارا ان کا ساتھ چھوٹ گیا۔ ملائشیا جاتے جاتے بھی وہ دونوں میاں بیوی ہم پر یہ احسان کر گئے کہ ہماری روزی روٹی کے بندوبست کے لیے مجھے ایک دکان کھلوا کر دے دی۔ شروع میں ہم کرائے کے مکان میں رہے پھر چند سالوں میں بچت کر کے یہ مکان خرید لیا۔ اس سلسلے میں تمہاری امی نے بھی بہت تعاون کیا اور اجرت پر خواتین کے کپڑے سی کر رقم جمع کرتی رہیں۔ انہیں سلائی کا ہنر بھی بیگم شوکت نے ہی سکھوایا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر خود اپنی محنت سے کما سکیں اور کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہ آئے۔

اللہ کا احسان ہے کہ ہم پر زندگی میں پھر کبھی ایسی نوبت نہیں آئی اور ہم نے تم دونوں کو ہمیشہ اپنی محنت کی کمائی سے ہی کھلایا۔ ہمارا ماضی جو بھی تھا لیکن تم دونوں بہنیں پورے فخر سے یہ کہہ سکتی ہو کہ تمہاری پرورش اور تعلیم میں استعمال ہونے والا پیسہ تمہارے ماں باپ کی محنت کی کمائی کا تھا۔ آج جو کچھ ہوا اس کا مجھے بہت صدمہ ہے لیکن یقین کرو کہ تمہیں جس جرم کی سزا آج ملی اس کے لیے ہم دونوں بالکل بے قصور ہیں کیونکہ اس بات پر ہمارا کوئی زور نہیں تھا کہ اللہ نے ہمیں پیشہ ور بھکاریوں کے خاندان میں پیدا کیا پھر بھی میں تم دونوں سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں کہ ہمارے شر... ماضی نے تم دونوں سے تمہارے مستقبل کی خوشی... چھین لیں۔'' مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے بعد گھر کے وہ چاروں نفوس آنگن میں ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے تھے اور افضل علی زندگی میں پہلی بار اپنی بیٹیوں کو اپنی داستان حیات سنا رہے تھے۔ کسی بھی باپ کی طرح ان کے لیے بیٹیوں کی بارات واپس لوٹ جانے کا صدمہ بہت بڑا تھا لیکن انہوں نے بہت حوصلے سے یہ صدمہ سہا تھا اور اس موقع پر بیٹیوں کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے سارے حقائق ان کے گوش گزار کر دیے تھے۔ اپنی داستانِ حیات سنانے میں انہوں نے کہیں کسی جھوٹ یا مصلحت سے کام نہیں لیا تھا اور بہت جرأت سے سب کچھ کہہ ڈالا تھا لیکن آخری جملے کہتے ہوئے ان کی آواز کپکپا گئی اور آنکھوں کے گوشوں سے آنسو بہہ نکلے۔ جمیلہ جو اس دوران بہت خاموشی سے آنسو بہاتی رہی تھیں ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بری طرح تڑپ اٹھیں لیکن اس سے قبل کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھتیں دونوں بیٹیاں ان سے زیادہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھیں اور دائیں بائیں سے افضل علی کے شانوں سے جا لگیں۔

''ہمیں آپ پر فخر ہے ابو، ایک باپ اپنی اولاد کے لیے جو کچھ کر سکتا ہے آپ نے ہمارے لیے اس سے کچھ بڑھ کر ہی کیا ہے۔ ہم آپ کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتے کہ آپ نے خود اپنی ذات پر اتنے دکھ اور پریشانیاں جھیلیں لیکن ہمیں ایک اچھی زندگی دی۔ آج ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا اسے ہم آپ کا قصور نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے لیا جانے والا ایک اور امتحان سمجھتے ہیں اور یقین رکھیے کہ اس امتحان میں پورا اترنے کے لیے ہم بالکل اسی طرح آپ کا ساتھ دیں گے جیسے اتنے سالوں سے اسی دیتی رہی ہیں۔'' یہ صنم تھی جو شدت سے آنسو بہاتی ہوئی باپ کو یقین دہانی کروا رہی تھی۔

''صنم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے ابو، آپ اللہ کے نیک بندے ہیں جب ہی تو وہ آپ کو اس طرح آزما رہا ہے لیکن اطمینان رکھیے کہ آزمائش کی ان گھڑیوں میں ہم ہر لحہ آپ کا ساتھ دیں گے۔ ہمارے لیے یہ بات بہت قابلِ فخر ہے کہ ہمارے باپ نے اپنے خونی رشتوں کو چھوڑنا قبول کر لیا لیکن ہمیں ان لوگوں میں شامل نہ ہونے دیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ناپسندیدہ ہیں۔ آج اس دنیا میں بھلے ہمیں سختیاں دیکھنی پڑیں لیکن یہ بات قابلِ اطمینان ہے کہ روزِ حشر ہمارا شمار ان لوگوں میں نہیں ہوگا جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے بے گوشت چہرے لے کر حاضر ہوں گے۔ ہم آپ کے احسان مند ہیں ابو کہ آپ نے ہمیں آخرت کی ذلت سے بچا لیا۔'' ارم نے بھی افضل علی کی بہترین تربیت کا ثبوت دیتے ہوئے صنم کی تائید کی اور ماں باپ کے سینوں پر آدھرنے والا بوجھ سرکنے لگا۔ ان کے اتنے سالوں کی محنت آج وصول ہو گئی تھی۔ ان کی اولاد نیک اور صالح تھی اور ایسی اولاد ہی دنیا و آخرت کی بھلائی کا سبب بنتی ہے۔

''جاؤ بیٹا، دونوں بہنیں جا کر اپنے کمرے میں آرام کرو۔ تمہارے ابو بھی تھکے ہوئے ہیں انہیں بھی آرام کی ضرورت ہے۔ جو ہونا تھا ہو گیا، آگے ہم تمہارے اچھے نصیب کے لیے دعا کرتے رہیں گے اور مجھے یقین ہے کہ جس اللہ نے اب تک ہمیں سہارا دیا وہ آگے بھی ہمیں تنہا نہیں چھوڑے گا۔'' صحن میں چھائی بوجھل اور جذباتی فضا کو جمیلہ نے سنبھالا او... خود پر قابو پاتے ہوئے ان دونوں سے کہا تو وہ سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے فوراً ہی اپنے کمروں کی طرف چل دیں حالانکہ یہ تو طے تھا کہ آج کی رات اس گھر کے کسی فرد پر نیند مہربان نہیں ہو سکتی۔ اُدھر جمیلہ اور افضل علی نے بھی اپنے کمرے کا رخ کیا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ روشو مجھ سے زندگی کے ایسے موڑ پر انتقام لینے کے لیے آ دھمکے گا۔ اس بدبخت نے تو میری معصوم اور بے گناہ بچیوں کی زندگی برباد کر کے رکھ دی۔'' افضل علی کو سہارا دے کر بیڈ پر بٹھاتے ہوئے جمیلہ نے گلوگیر لہجے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''ایسا مت سوچو جمیلہ، ہو سکتا ہے جسے آج ہم بربادی سمجھ رہے ہیں اسی میں اللہ نے ہماری بچیوں کے مستقبل کی بہتری رکھی ہو لیکن یہ انتقام والی بات مجھے سمجھ نہیں آئی۔ آخر روشو کی تم سے ایسی کیا دشمنی تھی کہ اس نے ہم سے انتقام لینا ضروری سمجھا؟''

''تھی ایک بات لیکن میں نے کبھی آپ کو نہیں بتائی۔ اصل میں شادی سے پہلے روشو خود میرے چکر میں تھا اس نے بڑی کوشش کی کہ مجھے ورغلا سکے لیکن میں اس کی باتوں میں نہیں آئی۔ آپ کو یاد ہی ہوگا کہ اس زمانے میں، میں کتنے تیز مزاج کی ہوا کرتی تھی ایک بار میں نے اس کی بدتمیزی پر غصے میں آ کر بیچ بازار میں اس کے منہ پر تھپڑ مارنے کے ساتھ ساتھ اس پر تھوک بھی دیا تھا۔ اس وقت اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ ایک نہ ایک دن مجھ سے انتقام ضرور لے گا۔ شادی کے بعد میں جتنے عرصے وہاں رہی مجھے یہی دھڑکا لگا رہا کہ روشو میرے ساتھ کوئی نہ کوئی بدتمیزی ضرور کرے گا۔ میں نے ہمیشہ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے دھمکی دیکھی لیکن آپ سے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور بعد میں جب آپ نے وہ زندگی چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو میں سمجھی کہ روشو سمیت ہر شے سے جان چھوٹ گئی ہے لیکن کیا معلوم تھا کہ قسمت ایسے وقت بڑا سے ہمارے سامنے لا کھڑا کرے گی۔ میری تو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ وہ یہاں پہنچا کیسے اور اسے ہمارا پتا کس طرح ملا؟'' انہوں نے ماضی کا ایک گوشہ شوہر کے سامنے بے نقاب کرنے کے ساتھ اپنی الجھن بھی بیان کی۔

''اس سلسلے میں بس اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں اس نے اتفاق سے مجھے دیکھ لیا ہوگا۔ آوارہ مزاج تو وہ شروع سے تھا بھٹکتا ہوا یہاں بھی پہنچ گیا ہوگا اور جب یہ دیکھا ہوگا کہ میں ایک عزت دار زندگی گزار رہا ہوں تو اس کے سینے پر سانپ لوٹ گئے ہوں گے۔ تھوڑی سی کوشش سے اسے ہمارے بارے میں معلومات بھی حاصل ہو گئی ہوں گی۔ اس لیے اس نے ہمیں ذلیل کرنے کے لیے موقع کا انتخاب کیا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ یہیں پر بس نہیں کرے گا۔ میں اس کا ماضی بھی ہوں اور اس کی فطرت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ وہ ہمیں مجھے مزید زک پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ کس طرح...... اس کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ برادری میں خبر کر دے کہ برسوں پہلے برادری چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہونے والے ہاشو اور سجو فلاں جگہ پر عزت دار بنے زندگی گزار رہے ہیں چل کر انہیں واپس برادری میں لے آؤ۔'' انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ جمیلہ نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

''ایسا ہوا تو ہم کیا کریں گے؟ بچیاں پہلے ہی بہت بڑے صدمے سے گزر رہی ہیں اب مزید کسی امتحان سے گزرنا پڑا تو جیتے جی مرجائیں گی۔''

''یہ صرف ایک خیال ہے اور میرا خیال ہے کہ روشو اس طریقے پر عمل نہیں کرے گا۔ اب حالات بیس سال پہلے جیسے نہیں رہے ہیں۔ آزاد ذرائع ابلاغ کا دور ہے۔ ہم نے کسی ٹی وی چینل سے رابطہ کرلیا تو برادری اور سردار دونوں مشکل میں پڑ جائیں گے۔ کوئی سماجی کارکن اس بات پر بھی راضی ہو جائے گا کہ میری طرف سے سردار پر زبردستی ٹانگ کاٹنے کا مقدمہ دائر کردے اس لیے جہاں تک میں سمجھتا ہوں روشو ایسا کچھ نہیں کرے گا۔ وہ بہت چالاک اور لالچی ہے۔ تم سے انتقام لینے کے بعد اب اس کی کوشش ہوگی کہ مجھے بلیک میل کرکے مجھ سے رقم اینٹھتا رہے۔ تم جانتی ہی ہو کہ وہ نوجوانی ہی سے نشے اور جوئے کا عادی ہوگیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا ہے کہ اس کی وہ بدعادات چھوٹی نہیں ہوں گی بلکہ مزید پختہ ہوگئی ہوں گی اس لیے اس کی زیادہ کوشش یہی رہے گی کہ مجھے دھمکا کر مجھ سے رقم وصول کرتا رہے۔ سردار کو اطلاع دینے میں تو اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا اور وہ ایسا صرف اسی صورت میں کرے گا جب اسے مجھ سے کسی فائدے کی امید نہیں رہے گی۔'' انہوں نے بڑی جزئیات کے ساتھ روشو کی آئندہ کی حکمتِ عملی کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا۔

''تو کیا آپ اس کے ہاتھوں بلیک میل ہوتے رہیں گے؟ اس جیسے لالچی بندے کا منہ تو کبھی بند نہیں ہوگا اور وہ ہر روز نئے تقاضوں کے ساتھ آپ کے سامنے آ کھڑا ہوگا۔ آپ ایک عام سے دکان دار ہی تو ہیں کوئی بہت بڑے بزنس مین تو نہیں کہ ہم اس کے مطالبات پورے کرتے رہیں گے۔'' جمیلہ کی پریشانی اب بھی ختم نہیں ہوئی تھی اور وہ دوسرے زاویے سے سوچ، سوچ کر ہلکان ہو رہی تھیں۔

''فی الحال تو مجھے ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ بعد میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح چپکے سے یہ مکان اور اپنی دکان فروخت کرکے ہم کسی اور شہر میں منتقل ہو جائیں۔ ان حالات میں ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ ہے بھی نہیں۔'' افضل علی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جمیلہ کو جواب دیا۔ حقیقتاً وہ خود بھی خاصے پریشان تھے۔ برسوں کی محنت کے بعد اب کہیں جا کر تو وہ وقت آیا تھا وہ خود کو پُرسکون محسوس کرنے لگے تھے لیکن روشو نے آ کر سب کچھ درہم برہم کر دیا۔ جوانی کے مقابلے میں اب اس عمر میں زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنا انہیں بہت دشوار لگ رہا تھا لیکن یہ حوصلہ تو انہیں کرنا ہی تھا۔ اداس اور ملول بیٹھی جمیلہ ہمیشہ کی طرح اب بھی ان کا ساتھ نبھانے کے لیے تیار تھیں اور انہیں یقین تھا کہ وہ دونوں مل کر ایک بار پھر زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

***

''تم نے آج میرا دل خوش کر دیا صنم، تم نے آج جس طرح ابو کا حوصلہ بڑھایا اس سے میرے دل کے سارے اندیشے ختم ہوگئے ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ ان حالات پر نہ جانے تم کس طرح ری ایکٹ کروگی۔'' دونوں بہنیں اپنے کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہوئیں تو ارم نے صنم کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے بہت محبت سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''میں تمہاری کیفیت کو سمجھ سکتی ہوں۔ تم نے پچھلے دنوں میرا جو رویّہ دیکھا تھا اس کے بعد تمہیں ایسا ہی سوچنا چاہیے تھا۔'' صنم نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''میرے لیے تمہارا وہ رویّہ بھی حیرت انگیز تھا اور یہ بھی۔ اس وقت میں سوچتی تھی کہ کیا تم وہی صنم ہو جسے ہمارے والدین نے میرے ساتھ ہی ایک جیسا اخلاقیات کا سبق پڑھا کر پروان چڑھایا ہے۔ اس وقت تم ایک خودسر، خودپسند اور عاقبت نااندیش لڑکی لگتی تھیں لیکن آج تم نے جس سمجھداری کا ثبوت دیا اس نے میرے سارے شکوے دور کر دیے۔'' ارم نے ایک بار پھر اس سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔

''ان دنوں میں راحم کی محبت کے غبارے میں بیٹھ کر آسمان پر اڑ رہی تھی۔ اس نے اپنی باتوں سے مجھے باور کروا دیا تھا کہ میں اس دنیا کی سب سے خاص لڑکی ہوں اور میری خاطر وہ کچھ بھی کرسکتا ہے لیکن آج میں نے دیکھ لیا کہ اس کا ہر دعویٰ اور وعدہ جھوٹا تھا۔ میرے لیے دنیا کے سامنے کھڑا ہونا تو دور کی بات وہ تو یوں دامن جھٹک کر چلا گیا جیسے میں انسان کے بجائے کسی گندی نالی کا کیڑا ہوں۔ بہرحال مجھے اس سے بھی کوئی شکوہ نہیں اس نے اپنے لیے جو مناسب سمجھا کیا البتہ جاتے جاتے مجھے یہ سبق سکھا گیا کہ انسان کو اس کے غرور اور تکبر کی سزا مل کر رہتی ہے۔ یہ راحم کا بخشا ہوا غرور ہی تھا جس نے مجھے میری سگی بہن کی نصیحتوں پر کان دھرنے سے روکا ہوا تھا لیکن آج میں جان چکی ہوں کہ میں کچھ نہیں ہوں اگر مجھ میں کچھ خاص ہوتا تو راحم کے لیے مجھے یوں ٹھکرا کر جانا آسان نہ ہوتا۔'' اس کی آواز بھرانے لگی۔

''اداس مت ہو، مجھے یقین ہے کہ اللہ نے تمہارے لیے راحم سے بھی زیادہ اچھا زندگی کا ساتھی سنبھال کر رکھا ہوگا اور جب وہ تمہیں ملے گا تو تمہیں یقین آجائے گا کہ تم واقعی بہت خاص ہو۔ بس راحم ہی تمہاری قدر نہ کرسکا۔'' وہ دونوں یکساں دکھ سے گزری تھیں لیکن جب عادت ارم نے زیادہ سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے اس کی دل جوئی کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔

''کتنی عجیب سی بات ہے ناں ارم، کل چند گھنٹے پہلے تک ہم سوچ رہے تھے کہ ایک ہی گھر میں دلہن بن کر جائیں گے اور ویسے ہی ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے جیسے ہمیشہ سے رہتے آئے ہیں لیکن اب ہماری حالت یہ ہے کہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اب ہمارا کیا ہوگا؟ ہماری حقیقت جاننے کے بعد کوئی ہم سے شادی پر راضی بھی ہوگا یا نہیں؟'' وہ نہایت دکھ سے اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگی۔

''یہ سب سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں...... جو بھی تقدیر میں ہوگا ہمارے سامنے آجائے گا لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اس سے بڑھ کر احمقانہ بات کوئی نہیں ہوسکتی کہ کوئی لڑکی شادی کو اپنی سب سے اولین ترجیح سمجھتے ہوئے باقی سب کچھ چھوڑ بیٹھے۔ ارے بھئی جب شادی ہونی ہوگی ہو جائے گی لیکن جو وقت ہاتھ میں ہے اس کا فائدہ اٹھا کر کچھ کرکے دکھاؤ۔ شادی نہیں بھی ہو تو کوئی غضب نہیں ہو جائے گا لیکن صرف اسی بات پر اپنی جان جلاتے ہوئے اپنی زندگی ضائع کردی جائے تو یہ بڑا ظلم ہے۔ عورت کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر خود کو معاشرے کا ایک فائدہ مند رکن ثابت کرے ورنہ اس میں اور کسی جانور میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔'' موقع ملا تو اس نے صنم کو اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا جو اس نے خلاف عادت خاموشی سے سنا اور قائل ہوتی ہوئی بولی۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں نے یہ سوچ کر کہ اب تو شادی ہو جانی ہے آگے ایڈمیشن بھی نہیں لیا جبکہ تم اس بات کو خاطر میں لائے بغیر محنت میں جتی رہیں۔ اب زندگی کے اس مرحلے پر تمہارے سامنے ایک واضح لائحہ عمل ہے۔ تم پڑھو گی، ڈاکٹر بنوگی اور کسی سہارے کے بغیر بھی اپنی زندگی گزارنے کے لائق ہو جاؤگی جبکہ میں...... میں کیا کر پاؤں گی۔ میرے دن رات تو اپنی حماقت پر آنسو بہاتے ہوئے ہی گزریں گے۔'' وہ ایک بار پھر یاسیت کا شکار ہونے لگی۔

''میرے نزدیک تو بیکار بیٹھ کر آنسو بہانے سے بڑھ کر احمقانہ فعل کوئی نہیں ہے۔ انسان اگر اس فضول کام میں وقت ضائع نہ کرے تو اپنے لیے بہت سی نئی راہیں ڈھونڈ سکتا ہے، تمہارے لیے بھی یہ ممکن ہے۔ کیا ہوا جو بی ایس سی میں ایڈمیشن کا وقت گزر گیا۔ تم پرائیویٹ بی اے کا امتحان بھی دے سکتی ہو۔ گریجویشن کرلو گی تو اس کے بعد دوسری بہت سی راہیں کھلی نظر آئیں گی۔ چاہو تو ایل ایل بی کرلینا یا ماسٹرز کرکے مقابلے کے امتحان میں بیٹھ جانا۔ لیکچرار، وکیل، سوشل ورکر یا اعلیٰ سرکاری افسر۔ تمہارے پاس بہت کچھ بننے کے لیے راہیں کھلی ہوئی ہیں بس تمہیں ذرا ہمت کرکے اپنے قدم آگے بڑھانے ہوں گے۔ کامیابی خود تمہارے قدموں کو چومنے آئے گی۔'' اس نے لمحہ بھر بھی صنم کو مایوسی کے اس گرداب میں پھنسنے نہیں دیا اور ایک جھٹکے سے باہر نکال لائی۔

''تم بہت اچھا سوچتی ہو بس، آئندہ میری توبہ کہ میں نے تمہاری کسی نصیحت پر کان دھرنے سے انکار کیا ہو۔ اب تو میں تمہاری ہر بات مانوں گی۔'' اس نے جھٹ اپنے کان پکڑ لیے تو ارم اس کے اس انداز پر مسکرا دی۔ صنم پر یہی شوخ اور چنچل انداز سجتا تھا اداسی میں لپٹی وہ ذرا بھی اس کے دل کو اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

''تو فی الحال میری یہ بات مانو کہ آرام سے سو جاؤ۔ امی اور ابو پہلے ہی بہت پریشان اور اداس ہیں۔ ہمارے کسی رویّے سے انہیں یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ اس رشتے کے ختم ہونے سے ہمیں کوئی صدمہ ہوا ہے۔ اس وقت ان کی ہمت بندھانے کے لیے ہمیں خود بھی ہمت سے کام لینا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے بی نصیحت میں تمہاری بات اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ اب تم بھی سو جاؤ۔'' صنم نے اسے جواب دیا اور بستر پر دراز ہو کر آنکھیں بند کرلیں۔ ارم بھی دوسری طرف کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ یہ وقت کا وہ لمحہ تھا جب بیک وقت دونوں کی آنکھوں سے چند خاموش آنسو نکل کر ان کے تکیے میں جذب ہو گئے تھے۔ وہ جس حادثے سے دوچار ہوئی تھیں وہ اتنا معمولی نہیں تھا کہ چند گھنٹوں میں فراموش کیا جا سکتا بس ہمت دکھائی جا سکتی تھی سو وہ دونوں نے ایک دوسرے کو دکھا دی تھی امید تھی کہ صدمے سے بھی جلد نکل جائیں گی کیونکہ بہرحال وہ ایسے والدین کی اولاد تھیں جنہوں نے اس سے بھی زیادہ برے اور مشکل حالات میں اپنے اور ان کے لیے جینے کی راہیں تلاش کرلی تھیں۔

***

''میں تم سے شرمندہ ہوں افضل علی! کل میں اتنے دباؤ میں آگیا تھا کہ واپس لوٹنے کے سوا کوئی راہ ہی نظر نہیں آئی تھی۔'' افضل علی تصور نہیں کرسکتا تھا کہ صبح دروازے پر ہونے والی پہلی دستک اسے حشمت کا چہرہ دکھائے گی۔

''ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں انکل، کل آپ کو ہماری وجہ سے جو تکلیف پہنچی اس کے لیے ہمیں دلی افسوس ہے اور ہم آپ سے معافی مانگنے کے لیے آئے ہیں۔'' حشمت صاحب کے ساتھ آئے عاصم نے بھی اپنی زبان کھولی۔

''مجھے تم لوگوں سے کوئی شکوہ نہیں بیٹا۔ میں اپنے نصیب کے لکھے پر شاکر ہوں۔'' افضل علی نے رات بھر میں خود کو سنبھال لیا تھا اور اب راضی بہ تقدیر تھا۔

''یہ تمہاری اعلیٰ ظرفی ہے افضل علی لیکن میں سمجھ سکتا ہوں کہ بیٹیوں کی بارات دروازے سے لوٹ جانے پر ایک باپ کے دل پر کیا گزرتی ہے۔'' حشمت کی بات سن کر افضل علی کے دائیں طرف بیٹھی جمیلہ کے ہونٹوں سے یک دم ہی ایک سسکی نکلی۔ اس سسکی کا درد اپنے دل میں محسوس کرتے ہوئے حشمت نے اپنی بات جاری رکھی۔

''مجھے نہایت شرمندگی ہے کہ آپ لوگوں کو یہ عظیم دکھ میری ذات سے پہنچا ہے لیکن یقین جانیں میں خود بھی اس وقت مجبور ہو گیا تھا۔ خاندان والوں کی باتیں، راحم کا انکار اور آپ کی بھابی کی مخالفت نے میرے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ راحم تو اتنا جذباتی ہے کہ کل ہی اپنی پھپھی زاد سے نکاح کر بیٹھا لیکن میرا یہ بیٹا بہت حساس ہے۔ اسی نے مجھے ہمت دلائی ہے کہ میں یہاں آکر آپ سے معذرت کرسکوں۔ یہ آپ کے گھر سے پھر رشتہ بھی برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اگر آپ دونوں میری معذرت قبول کرلیں تو ہم اس معاملے پر بھی بات کرسکتے ہیں۔'' حشمت کے ان چند جملوں نے انہیں ایک ساتھ کئی جھٹکے دیے تھے۔ ایک طرف انہوں نے انہیں راحم کے نکاح کی خبر سنائی تھی تو دوسری طرف دوبارہ عاصم کا رشتہ دے رہے تھے۔ افضل علی ان باتوں کو سن کر مخمصے میں پڑ گئے پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔

''میں آپ لوگوں کا شکر گزار ہوں لیکن اب میرے سامنے بیٹیوں کی شادی سے بھی زیادہ اہم مسائل ہیں۔ سب سے پہلے مجھے اپنے خاندان کو اپنی برادری سے بچانے کے لیے جدوجہد کرنی ہوگی۔ اب میرے لیے یہاں رہنا اور کاروبار چلانا ممکن نہیں ہوگا کیونکہ وہ لوگ مجھے سکون سے کچھ کرنے ہی نہیں دیں گے۔ پھر ارم کی تعلیم کا بھی مسئلہ ہے۔ ڈاکٹر بننا اس کا خواب ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ اس خواب کی تعبیر نہ پاسکے۔ اس کے علاوہ بھی میں اب کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے بچیوں کی رائے ضرور لوں گا۔''

''میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ رہا ہوں انکل اور پورے خلوص سے آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ میرا ایک دوست ڈی ایس پی ہے۔ وہ ان مسائل سے نمٹنے میں آپ کی مدد کرسکتا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی اس سے ملاقات کروا دوں۔'' عاصم کی پیشکش ایسی تھی کہ افضل علی کے لیے انکار ممکن نہیں تھا، وہ ایک ڈوبتا ہوا شخص تھا جسے تنکے کا سہارا بھی بہت تھا۔

***

''آپ پھر یہاں آگئے؟'' ارم نے اسے اپنے سامنے دیکھ کر بیزاری کا اظہار کیا۔

''مجھے آپ کی ہاں سننے کے لیے ہزار بار بھی یہاں آنا پڑا تو ضرور آؤں گا۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

''آپ اتنے سمجھ دار انسان ہیں۔ آپ کو میرا پوائنٹ آف ویو سمجھنا چاہیے، میں مانتی ہوں کہ آپ ہر اعتبار سے ایک بہترین انسان ہیں اور آپ نے نہایت

برے وقت میں ہماری مدد کی ہے لیکن میں آپ کا پروپوزل قبول کر کے ایک ایسی فیملی کا حصہ نہیں بن سکتی جہاں سے پہلے ہی مجھے ٹھکرایا جا چکا ہو اور جہاں دوسرے لوگ مجھے حقیر سمجھیں۔''

''آپ میرا یقین کریں کہ اب ایسا کچھ نہیں ہے۔ راحم اور امی پھپھو کی لاڈلی کو اپنانے کے بعد تجربہ کر چکے ہیں کہ نام نہاد خاندانی لڑکی اور ایک اچھی تربیت پانے والی لڑکی میں کیا فرق ہوتا ہے، امی تو اٹھتے بیٹھتے اس بات پر افسوس کرتی ہیں کہ انہوں نے ایسی ہیرا لڑکیوں کو گنوا دیا۔ اگر آپ ایک بار ہاں کہہ دیں تو وہ ایک بار پھر پوری عزت سے افضل انکل سے آپ کا ہاتھ مانگنے آپ کے گھر آسکتی ہیں۔''

''آپ مسئلے کے ایک نہایت اہم پہلو سے نظر چرا رہے ہیں عاصم صاحب! یہ صرف میرے اور آپ کے رشتے کی بات نہیں ہے۔ صنم بھی راحم سے منسوب رہی ہے اور میں اسے کسی دکھ اور اذیت سے دوچار نہیں کرسکتی۔'' اس نے نہایت صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''صنم کو راحم سے زیادہ اچھا زندگی کا ساتھی مل جائے گا لیکن مجھے لگتا ہے کہ مجھے آپ کا نعم البدل نہیں مل سکتا۔ میں نے عام لڑکوں کی طرح منگنی کے بعد آپ سے بھی اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا کیونکہ میں سوچتا تھا کہ سارے اظہار شادی کے بعد ہی کروں گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے دل و دماغ میں لائف پارٹنر کے طور پر صرف آپ ہی کا تصور ہے۔'' اس کے لہجے میں خلوص اور سچائی تھی جو ارم کو متاثر بھی کرتی تھی اس کے باوجود وہ اتنے عرصے میں صرف اس لیے اپنے دل کو راضی نہیں کرسکی تھی کہ اسے صنم کو دکھی کرنا قبول نہیں تھا۔ وہ گھر جہاں کبھی ان دونوں بہنوں نے اکٹھے دلہن بن کر جانے کے خواب دیکھے تھے۔ اکیلے اس کے لیے کیونکر قابل قبول ہوتا۔

''میری کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے مجھے جانا ہوگا۔'' وہ عاصم کے جذبوں سے پہلوتہی کرتی ہوئی آگے بڑھی تو عقب سے اس کی آواز سنائی دی۔

''جاؤ لیکن یاد رکھنا کہ میں تمہارا انتظار کرتا رہوں گا۔''

اس کے قدم پل بھر کے لیے ٹھٹکے لیکن پھر وہ آگے بڑھ گئی۔ کلاس کا تو بہانہ تھا اصل میں تو وہ عاصم سے دور جانا چاہتی تھی۔ اس شخص نے زندگی کے بدترین وقت میں ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔ افضل علی کے بھائی روشو کی اپنے ڈی ایس پی دوست کے ذریعے گوشمالی کروا کر ان لوگوں کی اس مستقل پریشانی سے جان چھڑانے کے علاوہ اس نے ان کی کراچی سے حیدرآباد منتقلی اور اس کے جامشورو میڈیکل کالج میں ٹرانسفر کے سارے مراحل میں بے حد مدد کی تھی۔ اس کے خلوص کو دیکھتے ہوئے افضل علی نے اس کے رشتے والا معاملہ ارم کے سامنے رکھ دیا تھا لیکن وہ راضی نہیں ہوئی تھی۔ خود صنم نے بھی اسے کنوینس کرنے کی کوشش کی تھی اور کہا تھا کہ وہ صرف اس کی خاطر اتنے اچھے رشتے سے انکار نہ کرے لیکن پھر بھی وہ خود کو آمادہ نہیں کرسکی تھی اور اپنی تعلیم کی تکمیل تک ایسے کسی بھی معاملے پر غور کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن وہ عاصم کا کیا کرتی جو ہر تھوڑے دن بعد کراچی سے حیدرآباد تک کا فاصلہ طے کر کے آتا تھا اور اس کے سامنے سوالی بن کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ وہ ہر بار اسے مایوس لوٹاتی تھی لیکن خود بھی ڈسٹرب ہو جاتی تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ بڑے الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ اس نے اپنی باقی رہ جانے والی کلاسز اٹینڈ کیں اور گھر واپس آگئی۔

گھر میں بھی وہ الجھی الجھی رہی۔ صنم نے ایک دو بار اس سے وجہ پوچھی لیکن وہ اسے ٹال گئی۔ صنم خود آج کل اپنے بی ایس سی کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھی اس نے حیدرآباد آکر داخلہ لے لیا تھا۔ اس لیے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ دوپہر سے شام اور شام سے رات ہوگئی۔ بظاہر وہ اپنے معمول کے مطابق سب کام انجام دیتی رہی لیکن قلبی کیفیت میں تبدیلی نہیں آئی۔ اس کے سامنے گزرے وقت کی کئی باتیں تھیں۔ اس عرصے میں وہ عاصم کے کردار اور خلوص سے اچھی طرح واقف ہو گئی تھی۔ اسے یہ بھی اعتراف تھا کہ زندگی کی جن مشکلات سے وہ اتنی آسانی سے نکل آئے تھے اگر عاصم کا تعاون ساتھ نہ ہوتا تو وہ مشکلات یوں آسان نہیں ہوتیں۔ پھر بھی وہ اس شخص کو ابھی تک ہاں نہیں کرسکی تھی۔ شاید دل سے اس بے عزتی کا احساس نہیں مٹتا تھا جو عاصم کے گھر والوں کے عین نکاح والے دن واپس لوٹ جانے سے انہیں اٹھانی پڑی تھی۔ رات کو وہ اپنے معمول کے مطابق کتابیں لے کر پڑھنے بیٹھی تو کچھ پڑھا نہیں گیا۔ سونے کا ارادہ کیا تو نیند نہیں آئی اور وہ کروٹوں پر کروٹیں بدلتی رہی یہاں تک

کہ اسے محسوس ہوا کہ افضل علی معمول کے مطابق تہجد کے لیے جاگ چکے ہیں۔ وہ کچھ دیر بستر پر ہی لیٹی اپنے باپ کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ زندگی کے کتنے کڑے امتحانوں سے گزرے تھے۔ گھر بار، رشتے ناتوں کو چھوڑا تھا، اپنی ایک ٹانگ گنوائی تھی، پیار و محبت سے پالی بیٹیوں کی بارات دروازے سے لوٹتے دیکھی تھی لیکن صبر و شکر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اپنے باپ کی یہ صفات اس میں بھی منتقل ہوئی تھیں لیکن پھر بھی وہ محسوس کرتی تھی کہ کچھ کمی سی ہے اپنی اس کمی کا سبب جاننے کے لیے وہ یک دم ہی بستر سے اٹھ کر باہر آ گئی۔ افضل علی اپنے معمول کے مطابق کھلے صحن میں تہجد کے نوافل ادا کرنے میں مصروف تھے۔ وہ ان سے کچھ فاصلے پر ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے بیٹا نیند نہیں آ رہی کیا؟'' افضل علی نے سلام پھیرا اور اسے وہاں موجود پا کر محبت بھری فکرمندی سے پوچھنے لگے۔

''آپ اتنے پُرسکون کیسے رہتے ہیں ابو! زندگی ہمیشہ آپ کے لیے ایک کڑا امتحان رہی ہے لیکن میں نے ہمیشہ آپ کو راضی بہ رضا دیکھا ہے۔ لوگوں کے پاس... بے شمار نعمتیں ہوتی ہیں لیکن پھر بھی وہ شکوے ہی کرتے نظر آتے ہیں اور ایک آپ ہیں کہ شکوہ کرنا تو دور کی بات ہر پل اللہ کا شکر ہی ادا کرتے رہتے ہیں۔'' ان کے سوال پر توجہ دیے بغیر اس نے اپنے دل کی بات کہی۔

''میں تمہیں یہ بات بہت عام سی مثال سے سمجھا سکتا ہوں۔ تم نے ماں اور بچے کا تعلق دیکھا ہے ناں... ماں اپنے بچے کو کتنا ہی جھڑکے، ڈانٹے یا مارے بچہ پلٹ کر اسی کی طرف جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ماں سے بڑھ کر کوئی اس سے سچی محبت کرنے والا نہیں ہے میرا بھی یہ یقین ہے کہ اللہ سے بڑھ کر کوئی مجھ سے مخلص نہیں ہے۔ اور جس کے خلوص کا یقین ہو اس سے شکوہ شکایت نہیں کرتے۔ میں اس بات پر کامل یقین رکھتا ہوں کہ اللہ مہربان ہے۔ اس نے اگر مجھے آزمائشوں میں مبتلا کیا ہے تو ان آزمائشوں سے نکالتا بھی رہا ہے۔ آگے بھی وہی میری مدد کرے گا۔'' اسے جواب دے کر انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کر لیے۔ وہ وہیں بیٹھی ان کے پُرنور چہرے کو دیکھتی رہی۔ کتنا سکون اور اطمینان تھا ان کے چہرے پر اور صرف اس لیے کہ انہیں اپنے رب کے خلوص پر یقین تھا اور وہ شکوہ کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔ ان کی سوچ کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے اپنے اندر موجود کمی کا ادراک ہو گیا۔ اس کے اندر ان جیسا یقین کامل نہیں تھا اسی لیے وہ ان جیسے سکون اور اطمینان سے بھی محروم تھی۔

''جس کے خلوص کا یقین ہو اس سے شکوہ شکایت نہیں کرتے۔'' وہیں بیٹھے بیٹھے ان کی مختصر گفتگو کو دہراتے ہوئے اسے ان کا یہ جملہ ایک بار پھر یاد آیا تو ذہن خود بخود عاصم کی طرف چلا گیا۔ اس کے خلوص پر شک کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی کہ وہ قدم، قدم پر اسے ثابت کرتا آیا تھا پھر بھی نہ جانے کیوں وہ اس کے خلوص کی قدر نہیں کر پا رہی تھی اور ایک مخلص شخص کی یہ ناقدری اسے بے سکون کیے ہوئے تھی۔ صنم کی دل آزاری کا بہانہ بھی بس یونہی تھا کہ راحم کی حقیقت جاننے کے بعد وہ اس کو فراموش کر چکی تھی اور زندگی کو پہلے کے مقابلے میں بہت سنجیدگی سے لینے لگی تھی۔ اس نے خود کئی بار اسے عاصم کا پرو پوزل قبول کرنے کی نصیحت کی تھی لیکن لاشعوری طور پر وہ اس شخص کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے لیے تیار نہیں تھی جس کے گھر والے اسے ایک بار ٹھکرا چکے تھے۔

''کیا بات ہے بیٹا ابھی تک یہیں بیٹھی ہو؟'' افضل علی دعا سے بھی فارغ ہو گئے لیکن وہ اپنی سوچوں میں الجھی تھی کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ابو بس آپ کی بات پر غور کر رہی تھی۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں جس کے خلوص پر یقین ہو اس سے شکوہ نہیں کرتے۔ میں نے بھی اپنی زندگی کے فیصلے اسی اصول پر کرنے کا تہیہ کر لیا ہے آپ دعا کیجیے گا کہ اللہ میرا حامی و ناصر ہو۔'' وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ انہیں جواب دے کر وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب جب عاصم دوبارہ اس کے سامنے آتا تو وہ اسے بتا دیتی کہ وہ اس کے خلوص کے آگے ہار چکی ہے اور بس اتنی مہلت چاہتی ہے کہ صنم کی کسی اچھی جگہ شادی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی تعلیم مکمل ہو جائے۔ عاصم جیسے مخلص شخص سے اسے امید تھی کہ وہ اس معمولی سی شرط کو قبول کر لے گا کہ جو محبت کرتے ہیں انہیں انتظار کرنے کا ہنر بھی آتا ہے۔